ابن انشاء

کے

مضامین

مرتبہ : حسن علی/آر،این خان
پبلشرز : ادارہ کتاب گھر
کمپوزنگ : MAK کمپوزرز، ٹاؤن شپ، لاہور

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

فہرست مضامین

پیش لفظ

ادارہ کتاب گھر http://www.kitaabghar.com جنوری ۲۰۰۳ء میں قائم کیا گیا تھا، اور ادارہ کتاب گھر نے نئی نسل کو کتابیں پڑھنے کی طرف راغب کرنے کے لئے مُفت کتابوں (e-books) کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں وسائل کی کمیابی اور وقت کی کمی کے باعث یہ سلسلہ ذرا سُست رہا، لیکن اب الحمدللہ بے شمار لوگ ہم سے رابطہ کر رہے ہیں اپنی تصانیف کتاب گھر میں بھجوانے کے لئے اور اس کے لئے ہم ان حضرات کے مشکور ہیں کہ وہ اس کارِ خیر میں ہمارے ساتھی بنے۔ کتاب گھر پر موجود کتابوں کی افادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن ہمارے بہت سے قارئین کا اصرار تھا کہ تنقید نگاری اور تجریدی ادب کے ساتھ ساتھ دلچسپ، عام فہم اور مشہور و معروف ادیبوں، مصنفین اور شعراء کرام کی کتابیں بھی آن لائن کی جائیں۔ اگر چہ کہ ہمیں بہت سے حضرات اپنی کتابوں کی کمپوزنگ بھیج رہے ہیں لیکن ہم نے خود سے کمپوزنگ کروانے کا سلسلہ بھی بند نہیں کیا ہے اور ہماری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اُردو ادب کی وہ کلاسک تحریریں جو اسکی شان ہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔

''ابن انشا کے مضامین'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس انتخاب میں ابن انشا کے مضامین، کالم، سفرنامہ اور ترجے جو انھوں نے مختلف رسائل کے لئے کئے سبھی میں سے کچھ نہ کچھ شامل کیا جائے تاکہ پاکستان سے باہر جو لوگ ابن انشا سے واقف نہیں ان کے اندازِ تحریر سے آشنا ہو سکیں۔ یاد رہے کہ ابن انشا نے یہ کتابیں ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں تحریر کی تھیں اور بعد میں نئی نسل کے بہت سے لوگ ان کی کتابوں سے استفادہ کر کے نام نہاد ادیب بن گئے اسلئے ہو سکتا ہے کہ بہت سے جملے یا واقعات پڑھ کر آپ کو لگے کہ یہ آپ نے پہلے بھی کہیں پڑھا ہے لیکن ان ادیبوں نے صرف ان کی تحریریں ہی نقل کی کاش وہ ابن انشاء کی تھوڑی سی ذہانت، وسیع النظری اور حب الوطنی بھی مستعار لے لیتے تو اردو ادب کا کچھ بھلا ہو جاتا۔

ادارہ کتاب گھر کی کوشش ہوگی کہ ہم ابن انشا کی مزید کتابیں بھی آپ کے لئے پیش کر سکیں اس کے لئے ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ آپ بھی اگر اپنی پسندیدہ کتاب ''کتاب گھر'' پر دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ای میل کیجیے یا اسکی کمپوزنگ ہمیں بھجوائیں۔ ہم اسے آپ کے نام کے ساتھ آن لائن کریں گے۔ ہمیں آپ کی آراء، تنقید اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

حسن علی خان (ویب ماسٹر)
ادارہ کتاب گھر

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

تعارف ابن انشا

(پیدائش ۱۹۲۷، وفات ۱۹۷۸)

شاعر اور مزاح نگار ابن انشاء کا اصل نام شیر محمد قیصر تھا۔ وہ ۱۹۲۷ء کو لدھیانہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے ممبر بنے۔ قیام پاکستان سے قبل بحیثیت مترجم آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد انہوں نے بھارت کی بجائے پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس برس کی تھی۔ پاکستان منتقل ہو کر انہوں نے صحافت کو پیشہ بنایا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کیا اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ کراچی میں قیام کے دوران ابن انشاء کو مولوی عبدالحق جیسے محقق سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ ابن انشا نے سرکاری ملازمت کی، کچھ عرصہ نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر رہے اس کے علاوہ روزنامہ ''امروز'' کراچی میں ''خانہ بدوش'' کے قلمی نام سے قلم کاری کی اور ''روزنامہ جنگ'' کے لئے ''حرف و حکایت'' کے عنوان سے کالم بھی لکھے۔ سرطان جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر بغرض علاج لندن گئے اور وہیں وفات پائی۔

ابن انشا جتنے اچھے شاعر تھے اُتنے ہی اچھے ادیب اور اس سے زیادہ اچھے اور محبِ وطن انسان تھے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' اور ''خمار گندم'' کو ظریفانہ ادب میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس میں آپ نے عوامی اور قومی مسائل کو مزاح کی آڑ میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ آپ کا ادبی دور ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی کا رہا ہے لیکن پاکستان کی بدقسمتی کے اس دور کے مسائل میں سے بیشتر آج بھی جوں کے توں موجود ہیں اسلئے ابن انشا کے مضامین آج بھی ویسے ہی تازہ محسوس ہوتے ہیں جیسے اس دور میں۔ ابن انشا کا سب سے پہلا سفرنامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں جنگ اخبار میں قسط وار چھپتا رہا اور اسقدر مقبول ہوا کہ بعد میں قارئین کے اصرار پر ''لاہور اکیڈمی'' نے اسے کتابی شکل میں چھاپا۔ ان کے سفرناموں میں نہ تو محض مصنف کے شناساؤں کے ناموں اور جگہوں کی معلومات کی بھرمار ہے اور نہ ہی وہاں ملنے والی حسیناؤں کے التفات کے قصے، بلکہ ابن انشا نے خود کو کسی بھی عام آدمی کی طرح پیش کیا ہے جو وہاں کی زبان، حالات اور محل وقوع سے ناآشنائی کے باعث اور پیسے بچانے اور سستے ہوٹل ڈھونڈنے کے چکر میں دوران قیام عجیب عجیب صورتحال سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لیئے ان کے سفرناموں کو عوامی سطح پر بہت پزیرائی ملی۔

ان کی دیگر تصانیف میں تین عدد شعری مجموعے، ''چاند نگر''، ''اس بستی کے اک کوچے میں''، ''دل وحشی'' اور چار سفرنامے ''آوارہ گردی کی ڈائری'' ''ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں''، ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' اور ''نگری نگری پھرا مسافر'' کے علاوہ ان کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب ''خط انشاؔ جی کے'' بھی شامل ہے۔ لندن میں انکی وفات کے وقت انکا آخری سفرنامہ ابھی زیرِ طباعت تھا جسکا نام ان کے اپنے ہی ایک شعر ''نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا'' پر ''نگری نگری پھرا مسافر'' رکھا گیا۔ ابن انشاء نے بہت سی انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ خاص طور پر امریکن افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کو اردو دنیا سے متعارف کروایا۔

ابن انشاء کی تحریر کی نمایاں خصوصیات میں طنز و مزاح، پیروڈی کا انداز، وسعت معلومات، سیاسی بصیرت، غیر ملکی زبانوں سے استفادہ اور صورت واقعہ سے مزاح کشید کرنا بطور خاص قابل ذکر عناصر ہیں۔ ان کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔'' ابن انشا بہت بہادر انسان تھے، اپنے آخری دنوں میں جب وہ لندن کے ایک ہسپتال میں اپنی بیماری سے لڑ رہے تھے تو انھوں نے ایک کالم ''بیمار کا حال اچھا ہے'' کے عنوان سے لکھا جسے پڑھ کر بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص اپنی زندگی کے آخری سانسیں لے رہا ہے۔ یہ مضمون زیرِ نظر کتاب میں ادارہ نے خاص طور پر آپ کے لئے شامل کیا ہے۔

ادارہ کتاب گھر

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

ذرا فون کرلوں؟

جب تک آپ کے گھر میں ٹیلیفون نہ ہو آپ کبھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ عوام الناس بالخصوص اپنے محلّے والوں میں کتنے مقبول ہیں۔ ہمیں بھی اسکا پتہ اس وقت چلا جب ہم پچھلے دنوں بیمار ہو کر صاحبِ فراش ہوئے۔

شیخ نبی بخش تاجرِ چرم ہمارے محلّہ دار ہیں۔ ان سے علیک سلیک ہے۔ گاڑھی چھننے والی کوئی بات نہیں۔ ہمیں ان کے حُسن اخلاق کا بھی اندازہ نہ تھا۔ ہمارے بیمار ہونے کے بعد سب سے پہلے وہی تشریف لائے۔ ہمارے پٹی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ تعزیت کرنے والوں کا منہ بنایا اور پوچھا، کیا شکایت ہے؟

ہم نے کہا، ''آپ سے کوئی شکایت نہیں، واللہ نہیں۔''

فرمانے لگے، ''ارے میاں! ہم بیماری کا پُوچھ رہے ہیں۔''

ہم نے بتایا کہ معمولی کھانسی ہے، بخار ہے۔ بولے، ''اسکو معمولی نہ جانئے گا۔ میری بیوی کے بھانجے کو بھی یہی عارضہ تھا۔ آپ ہی کی عمر کا رہا ہوگا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔''

''مر گیا؟'' ہم نے بوکھلا کر پوچھا۔

فرمایا ''ہمارے لئے تو مر ہی گیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کینیڈا چلا گیا۔ وہاں سُنا ہے شادی کر لی۔ ہمیں تو اب خط بھی نہیں لکھتا۔''

ہم نے حیاتِ تازہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ رشک انکی بیوی کے بھتیجے کی قسمت پر بھی آیا۔ بہر حال ہم نے ان بزرگ سے کہا ''آپ نے ناحق مزاج پُرسی کے لئے آنے کی زحمت فرمائی۔ بہت بہت شکریہ۔''

اُٹھتے اُٹھتے اتفاق سے اُن کی نظر فون پر پڑ گئی۔ بولے اپنی دُکان پر فون کرلوں؟ جو شخص اتنی محبت سے حال پوچھنے آئے۔ اُس سے کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا شوق سے کیجئے۔

وہ گئے ہی ہونگے کہ ریٹائرڈ تھانیدار اور حال ٹھیکیدار میر باقر علی سندیلوی لٹھیا ٹیکتے آئے۔ بولے سُنا تھا ''آپ کے دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔''

''ہمارے دشمنوں کی تو نہیں۔ ہمیں ضرور کھانسی بُخار ہے۔'' ہم نے وضاحت کی۔

نہایت شفقت سے ہماری نبض ٹٹولتے ہوئے بولے ''کچھ دوا دارو کرو۔ احتیاط رکھو۔ تُم جیسا ادیب اور انشاء پرداز کم از کم ہمارے محلّے میں تو کوئی اور نہ ہوگا۔ اگر خدانخواستہ، قضا و قدر کے کان بہرے، کوئی ہرج مرج ہو گیا تو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔''

انہوں نے کچھ کہا۔ ہم اپنی وحشت میں کچھ اور سمجھے۔ چنانچہ بہ آوازِ بلند عرض کیا ''قبلہ یہ سُن کر افسوس ہوا کہ آپ کے کان بہرے ہو رہے ہیں۔ ان میں باقاعدہ چنبیلی کا تیل گرم کر کے ڈالا کیجئے۔ اب رہا نقصان، سو ٹھیکیداری میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے۔''

اس پر ہمارے ایک دوست نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے، ہمیں جھنجوڑا اور میر صاحب سے معذرت کی کہ 'معاف کیجئے۔ یہ شخص یونہی بہکی بہکی باتیں کیا کرتا ہے۔ آپ کی مزاج پرسی کا شکریہ۔''

اسپر انہوں نے فرمایا کہ مزاج پرسی تو میرا بحیثیت مسلمان اور ہم محلّہ ہونے کے عین فرض تھا۔اسمیں زحمت کی کوئی بات نہیں۔پھر اُٹھتے اُٹھتے بولے،"میرا لڑکا نالائق صبح سے بھٹے پر گیا ہوا ہے۔میں یہاں اینٹوں کے ٹرک کا انتظار کر رہا ہوں۔اجازت ہو تو اُسے فون کرلوں۔"

شوق سے کیجئے۔ہم نے کہا آپ ہی کا فون ہے۔

اسکے بعد پروفیسر کے۔بخش کے آنے کی اطلاع ہوئی۔انکے نام نامی سے کون واقف نہیں۔سعید منزل کے سامنے بیٹھتے ہیں اور قسمت کا حال بتاتے ہیں۔مقدمہ، بیماری، روزگار ہر مسئلے پر اُن کا مشورہ مفید رہتا ہے۔لاعلاج بیماریوں کے مایوس مریضوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔نام کریم بخش اور پروفیسر بننے سے پہلے ہمارے ایک عزیز کے ہاں خانساماں تھے۔ان کی راہ و رسم ہم سے اُنہی دنوں سے ہے۔آیئے، بیٹھیے، ہمارا حال پوچھا۔پھر ہمارے ڈاکٹر کا نام و پتہ دریافت کیا۔پھر ڈاکٹروں اور ڈاکٹری طریقہ علاج کے متعلق کچھ چار حرفی ناقابل طباعت کلمات ارشاد فرمائے۔اسکے بعد تشخیص کی اور کہا کہ تمہارے جسم میں شکر کی کمی ہے اور گلا خراب ہے۔اپنے مجربات میں سے بھی ایک چیز بھیجنے کا وعدہ کیا جو مینڈک کی چربی، گندھک اور لال ٹڈے کے انڈوں سے بنتی ہے اور اُلو کے مغز کے ساتھ نہار مُنہ کھانی پڑتی ہے۔یہ بھی اُٹھتے ہوئے ٹیلی فون پر ایک جگہ آرڈر دے گئے کہ آدھا سیر گھیکوار اور دو نیولے مجھے کل میرے فٹ پاتھ پر بھجوا دیئے جائیں۔

ہم تو لوگوں کے اخلاق کریمانہ کے ممنون ہوتے رہ گئے۔ہمارے بھائی نے ہمارے نہ نہ کرتے ہوئے بھی کمرے میں نوٹس لگا دیا کہ جو صاحبان مزاج پُرسی کو آئیں وہ فون کو ہاتھ نہ لگائیں اور جو فون کرنے آئیں وہ مزاج نہ دریافت کریں۔

ہم ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔رات کے وقت گھر پر ہوتے ہیں، خدا جانے لوگوں کو کیسے گمان ہو گیا کہ ہم نے میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے۔حالانکہ ہمیں پچھلے دنوں محکمہ فیملی پلاننگ نے سندِ خوشنودی عطا کی ہے کہ لوگ تو بچوں کے معاملے میں احتیاط برتتے ہیں۔آپ ان سے بھی زیادہ دُور اندیش ہیں۔بہر حال دن میں چار چھ فون ضرور اس قسم کے آتے ہیں۔

"ذرا میری بیگم کو بلا دیجئے۔"

"میرے ہاں لڑکا ہوا یا لڑکی، اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"ذرا ایمبولینس بھیج دیجئے۔جلدی کیجئے۔میں سیٹھ بھولو بھائی مٹی کے تیل والا کھارادر سے بول رہا ہوں"

اگر کہیں کہ ایمبولینس ہمارے پاس نہیں اور نہ ہمیں آپ کی بیگم صاحبہ سے تعارف ہے نہ ہم آپ کی اولادِ نرینہ و مادینہ میں اضافے کا مشتاق ہیں تو جواب ملتا ہے۔"یہ کیسا میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے آپ نے، میٹرنٹی ہوم ہے یا یتیم خانہ؟"

کئی بار جی چاہا ان سے کہیں کہ آپ کے بچوں کی رعایت سے اسکے یتیم خانہ ہونے میں آپ ہی کا نقصان ہے، لیکن پھر مختصر اُعرض کرتے ہیں کہ جی میٹرنٹی ہوم نہیں، ایک یکہ و تنہا آدمی کا گھر ہے۔اگرچہ کراچی کی شرح پیدائش دیکھنے کے بعد جی ہمارا یہی چاہتا ہے کہ کاش یہ ہمارا گھر نہ ہوتا، میٹرنٹی ہوم ہوتا۔جس جگہ کے لئے یہ فون کئے جاتے ہیں۔اسکے اور ہمارے فون نمبر میں فقط ایک عدد کا فرق ہے۔

یہی نہیں، ایک حلوہ مرچنٹ کا نمبر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ہمیں اکثر فرمائشیں اس قسم کی آتی ہیں کہ پندرہ سیر لڈو بھیج دیجئے اور ایک ٹوکرا بالوشاہیوں کا بھی۔اصلی گھی کا۔پہلے کی طرح چربی میں تل کے نہ بھیج دیجئے گا۔ایک بار ان حلوہ مرچنٹ صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔انہوں نے بتایا کہ اکثر مشاعروں کے لئے غزلوں کی فرمائش ان سے کی جاتی ہے اور رسالے والے تو ہمیشہ سر رہتے ہیں کہ آپ کی نگارشات کا انتظار ہے۔سالنامہ نکل رہا ہے، جلدی کیجئے۔

بعض لوگ صبر والے ہوتے ہیں، ہمیں "سوری، رانگ نمبر" کہنے کی مہلت مل جاتی ہے۔لیکن بعضوں کو جلدی ہوتی ہے۔ایسے ہی ایک صاحب کا کل فون آیا۔

''لکھیے، چار چھولداریاں۔''

ہم نے عرض کیا، ''معاف فرمایئے۔۔۔۔۔۔''

بات کاٹ کر بولے، ''باتوں کا وقت نہیں، لکھتے جایئے، بارہ ڈنر سیٹ اچھے ہوں، پہلے جیسے پھٹیچر نہ ہوں۔''

ہم نے پھر کھنکار کر کہا، ''اجی! سنئے تو۔۔۔۔''

دُرشتی سے بولے، ''چار چاندنیاں بھی ڈال دیجئے۔ صاف ہوں، سالن گری نہیں چاہئے، ہمارا پیسہ حلال کا پیسہ ہے۔۔۔''

ہم نے پھر کچھ کہنا چاہا، لیکن۔۔۔۔ لیکن اُدھر سے حُکم ہوا کہ پہلے انکی فرمائش نوٹ کی جائے، پھر بات کی جائے۔

''اٹھارہ ڈونگے، بہتر پلیٹیں، پانچ لالٹینیں، ڈیڑھ سو چمچے، دس جگ۔۔۔''

ہم سب لکھتے گئے، جب وہ ذرا دم لینے کو رُکے تو ہم نے عرض کی، ''قبلہ۔ ہم فقیر آدمی ہیں، ہم اتنی ساری چیزیں، یہ خس خانہ برفاب کہاں سے لائیں گے؟''

اُدھر سے سوال ہوا۔ ''آپ حاجی چراغ دین اینڈ سنز نہیں کیا؟''

ہم نے کہا۔ ''جی نہیں۔ کاش ہوتے۔''

بھڑک کر بولے ''آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھے آدمی ہیں آپ۔''

(ابن انشاء کی تصنیف ''خمار گندم'' سے لیا گیا ایک مضمون)

☆☆☆☆☆

جنتری نئے سال کی

؎ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج

یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آئی ہے۔ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتریوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہورِ عالم، مُفید عالم جنتریاں دوکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔ بعض لوگ جنتری نہیں خریدتے۔ خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔ اپنی قسمت کا حال، اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خرید لو اور دُنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اسمیں، نمازِ عید اور نمازِ جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، دائمی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیائے کرام کی کراماتیں، لکڑی کی پیائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کے لیے موزوں ہے، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے، اعضاء پھڑکنے کے نتائج، کرہ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ۔ یوں تو سبھی جنتریاں مفید مضامین کی پوٹ ہوتی ہیں۔ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ لیکن روشن ضمیر جنتری (جیبی) کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اسوقت ہمارے سامنے اسی کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔

ایک باب اس میں ہے "کون سا دن کون سے کام کے لیے موزوں ہے"

ہفتہ:۔	سفر کرنے، بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے
اتوار:۔	شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لیے
بدھ:۔	نیا لباس پہننے، غسلِ صحت کے لیے
جمعرات:۔	حجامت بنانے، دعوتِ احباب کے لیے
جمعہ:۔	غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لیے

ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آ جائے۔ ہفتے کا دن آیا اور سبھی لوگ سوٹ کیس اُٹھا کر سفر پر نکل گئے۔ جو نہ جا سکے وہ بچوں کو اسکول میں داخل کرانے پہنچ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسکول کھلے ہیں یا نہیں، یا کسی کے بچے ہیں بھی کہ نہیں۔ جدھر دیکھو، بھیڑ لگی ہے۔ اتوار کو ہر گھر کے سامنے چھولداریاں تنی ہیں اور ڈھولک بج رہی ہے۔ لوگ سہرے باندھنے کے بعد جنتری ہاتھ میں لیے افسروں سے ملاقات کرنے چلے جا رہے ہیں۔ بدھ کو سبھی حماموں میں پہنچ گئے اور جمعرات کو لوگوں نے حجامت بنوائی، اور دوستوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں آ کر دعوت کھا جائیو۔ جمعہ کو نکاح ثانی کا نمبر ہے۔ جو لوگ اس منزل سے گزر چکے ہیں، وہ دن بھر نل کے نیچے بیٹھ کر نہائیں کہ ستاروں کا حکم یہی ہے۔

ہم جوخواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم عام قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑے تنوع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بلند رتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکنے کی اصل وجہ اب معلوم ہوئی۔ من نہ کردم شما حذر بکنید۔ اسی طرح گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے، دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب وکٹوریہ کے گھوڑے سے نہیں، ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مُراد سفر پیش آنا ہے۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں، ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیے۔ بلی کا پنجہ مارنا، بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا، دُشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھئے موت قریب ہے۔ (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالیے، نکل آئے گی)۔ اپنے سر کو گدھے کا سر دیکھنے کا مطلب ہے، عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا، اسکے متعلق اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ خواب میں مردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے، درازی عمر۔ خدا جانے یہاں عمرِ فانی سے مراد ہے یا عمرِ جاودانی سے۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضاء کے پھڑکنے اور انکے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار، شانہ راست، گوشِ چپ، انگشت چہارم، زبان، گلا، گردن بجانب چپ، تھوڑی، بغلِ راست وغیرہ، ان پچاسی اعضاء میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان میں سے بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کردیں تو فحاشی کی زد میں آجائیں۔ ایک دو امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کرگئے۔ تنگہ انتخاب کی پسلی پھڑک اُٹھنا استادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اسکا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگِ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اُٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے ایسی کوئی جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

"محبت کے مارے کو چاہیے کہ ۱۲ مارچ کو بوقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب، مشرق کی طرف منہ کر کے نقش ذیل کو نام مطلوب بمع نام والدۂ مطلوب، اُلو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بوقت صبح ایک گھڑی ۴۵ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہوجائے گا"

۹۱، ۱۱م و م ۱۰ ع ۱۱ ع ۱۱

نام مطلوب مع والدۂ مطلوب، اپنا نام مع نام والدۂ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات نہیں کرتا تو اسکی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر اُلو کو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بوقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوعِ آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سائے میں آئے؟ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے 'جنتر منتر مکمل' نامی جو کتاب بقیمت چھ روپے شائع کی ہے، اس میں ان کی تفصیل مل جائیگی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں، محبت میں اتنا کشٹ نہیں اُٹھا سکتے ان کے لیے مرتب جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیے ہیں۔ جن کی بدولت محبوب قدموں پر تو خیر آکر نہیں گرتا، لیکن مائل ضرور ہوجاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیے، اور چالیس دن تک یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ ازراہِ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک من آٹے میں محبوب کو راضی کیا جاسکتا ہے۔ جو حضرت اس میں بھی

خست کریں اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب بھی محبوب سامنے آئے، آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمد، دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف مُنہ کر کے پھونکیں۔ اس طرح کہ مُنہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی۔

یہ عمل بظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں۔ اوّل تو محبوب کو اتنی دیر سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں، اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ پھر آپ جو پھونکیں ماریں گے اسکی بناء پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا۔ اسکے متعلق ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے 'محبت کا سرمہ' استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کا بنانا تھوڑی محنت ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر "جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے، وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا۔"

یہ سرمہ بنانے کے لیے حاجتمند کو ۱۹ فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روز وہ بوقتِ طلوعِ آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اسکی راکھ میں چمگادڑ کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بوقتِ صبح ایک گھڑی ۱۵ پل بعد طلوعِ آفتاب لکھے اور اس پر سورۂ فلق گیارہ سو بار پڑھے پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اسکی سیاہی آنکھوں میں ڈالے۔ حسبِ ہدایت ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگایا تھا۔ اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں نہیں معلوم۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹمل اور مچھر مارنے اور مشہورِ عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ اُردو میں کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں، معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کیا ہوتی ہے۔ بے ادب شرط، منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا وغیرہ دیکھی ہے۔ الم غلم مضامین کا طومار ہے۔ اہل دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ نہ نسخے نہ تعویذ، نہ عرسوں کی تاریخیں، نہ محبت کے عملیات، نہ خوابوں کی تعبیریں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے۔ اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

(ابن انشاء کی تصنیف 'خمارِ گندم' سے لیا گیا ایک مضمون)

☆☆☆☆☆

آؤ حسن یار کی باتیں کریں

آؤ حسن یار کی باتیں کریں لیکن سیاست کی طرح حسن یار بھی قباحت سے خالی نہیں۔ آج کل حسن میں بھی دایاں بازو اور بایاں بازو دیکھا جاتا ہے۔

کاکل ورخسار کی باتیں کریں۔

لیکن کاکل کی سیاہی اور رخسار کی سرخی کے بھی سیاسی معنے لیے جاتے ہیں۔ لکھنے والا نہ بھی لے پڑھنے والا لے گا اور یہ کاکل وغیرہ تو پرانے زمانے میں بھی اپنا مذہب دین ہم اہل اسلام سے الگ رکھا کرتے تھے اور حسن چونکہ اس زمانے میں صرف انگریزوں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صاحبوں کے پاس ہوتا تھا۔ اس لیے ہمیں کہنی مار کر گھس بیٹھ کر آگے نکل جاتے تھے۔ استاد ذوق نے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہی اپنی عزت اپنے ساتھ لے کر اور مسودات محمد حسین آزاد کے لیے چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور جن کے سیاسی شعور پر ان کے شاگرد بھی اصرار نہیں کرتے جو اپنی بات ہے اور غالب کے نام لیواؤں کے لیے قابل تقلید ہے، ایک جگہ لکھا ہے

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے، ہندو بڑھے

پس حسن موضوع سے خارج اور کاکل بھی اور اس کے دوسرے غیر مسلم بھائی بند بھی تو بات کیا کی جائے۔ ولایت میں ایسے موقع پر صرف موسم کی بات کی جاتی ہے لیکن یہی موسم ہمارے شاعر کے ہاتھ آتا ہے تو اتنا معصوم نہیں رہتا

فروغ لالہ وصوت ہزار کا موسم

یہ سچ ہے ہمارے فیض صاحب ہر شعر دونالی قلم سے لکھتے ہیں۔ ایک نال کوئے یار کی طرف، دوسری سوئے دار نشانہ لیے رہتی ہے۔ تاہم سیاست کا شائبہ رہتا ہے اور ادھر کو مضمون زیادہ جھک جائے تو سیاست دربان کا کھٹکا۔ یہاں ولایت میں ایسا نہیں ہے۔ موسم بات کرنے کا بہانہ ہے۔ جھڑی لگی ہے، جان ضیق میں ہے اور زبان پر گڈ مارننگ، جون گیا، جولائی کی تشریف آوری ہوگئی۔ اپنے ہاں کا موسم قارئین کرام جانیں یہاں پچھلی اتوار ہم گھر میں بولائے ہوئے ہائیڈ پارک طرف نکل گئے۔ دھوپ بھی کھلی تھی لیکن ہوا کا زور ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا سیدھی برزنیف صاحب نے نشانہ باندھ کے سائبیریا یا ٹنڈرا کے میدانوں سے ادھر بھیجی تھی۔ ہمارے دانت بجنے لگے جو کڑاکے کی سردیوں میں بھی کبھی نہ بجتے تھے۔ جب تک گھر واپس آ کر ڈیڑھ رضائی کی بکل میں نہ بیٹھے سکون نہ ہوا۔ اب بتائیے موسم کے اتنے فرق کے ساتھ ہماری اور ہمارے قارئین کی سوچ کس طرح ایک سی ہو سکتی ہے۔ خیر اس برس سردی کا اب تک چلنا غیر معمولی ہوگا۔

پچھلے سال ہم نہ تھے، سنا ہے، یہاں غیر معمولی گرمی تھی لیکن دیس دیس میں رت رت کی بات الگ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں برکھا کے خیال سے ملہار گاتے ہیں، یہاں رینی سیزن یعنی برسات کا برا مناتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہاں بھی رم جھم اچھی اچھی لگتی ہے، اس کے لیے جاڑا تک گوارا ہے موسموں کے بارے میں ہمارا ایک شعر ہے

؎ شام سے لے کر پو پھٹنے تک کتنی رتیں گزرتی ہیں

آس کی آندھی یاس کی پت جھڑ، صبح کے اشکوں کی برسات

لیکن ہندی کا جو شعر یا کلام موسموں کے حوالے سے ہمیں پچھلے دنوں بہت یاد آتا رہا۔ جانے کس کا ہے۔ ہم نے سکول کے زمانے میں پڑھا تھا۔

؎ برس رہی ہیں لہو کی بوندیں

رنگی ہوئی ہے لہو میں چولی

بتاؤ ساون کہ ماس پھاگن۔

ملہار گاؤں کہ گاؤں ہولی۔

اخبار اٹھا کے دیکھتے ہیں تو ایک طرفہ خبر نظر آتی ہے جو شیخ و برہمن کی آویزش کی یاد دلاتی ہے۔ صاحبان خیر میں سے ایک تو خیر سچ مچ کے شیخ ہیں اور کسی معنوں میں بھی لیجئے بہت ہی شیخ ہیں، دوسروں کو اس لحاظ سے برہمن کہہ لیجئے کہ جمال ہمنشیں ان میں کوئی بیس بائیس برس اثر کرتا رہا جس کے باعث پہلے بھی حکومت میں تھے، اب کے بھی حکومت میں ہیں۔ آپ نے پڑھ لیا ہوگا کہ بھارتی وزیر دفاع جگ جیون رام نے شیخ عبداللہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی خرابی صحت کے باعث سیاسی زندگی سے ریٹائر ہو جائیں۔ شیخ عبداللہ نے بجائے اس کے کہ اس مشورے کا شکریہ ادا کرتے جس کی فیس بھی جگ جیون جی نے نہیں مانگی۔ کیونکہ وزارت دفاع کی دی ہوئی تنخواہ اور اندرا گاندھی کے زمانے کا پراویڈنٹ فنڈ ان کے لیے کافی ہے۔ بڑی دیدہ دلیری سے یہ مشورہ لوٹا ہی نہیں دیا۔ جگ جیون رام صاحب کو یاد دلایا کہ ان کی عمر کتنی ہے اور صحت کا حال کیا ہے اور کیسے انہیں تھوڑے دنوں پہلے دل کا دورہ پڑا تھا۔ مستعفی ہونا چاہیے تو ان کو ہونا چاہیے۔

ہم بڑے آدمیوں کے بیچ میں نہیں پڑتے۔ ہمارے دونوں محترم۔ ہمارے نزدیک دونوں ٹھیک کہتے ہوں گے اور ہماری ناقص رائے میں دونوں ایک دوسرے کے مشورے کو مان لیں تو ہماری مرنجان مرنج اور صلح کل طبیعت کو خوشی ہو۔ لیکن جگ جیون رام جی کا بیان سیاست میں ایک طرح کی بدعت ضرور ہے۔ لوگ عام طور پر اپنے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ میں خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہو رہا ہوں اگرچہ بیان دینے کے بعد اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتے بھی پہنچ جاتے ہیں، کسی دوسرے کے باب میں ایسا کہنے کا دستور نہیں حالانکہ خدا لگتی پوچھیے تو یہ بات جس کا دستور نہیں، عقل کے زیادہ قریب ہے۔ ہاں اتنا مشورہ ہم دیں گے کہ مشورہ دیتے ہوئے بیان دینے والے کو اپنے مخالف کی ولادت کا سرٹیفکیٹ تصدیق شدہ میونسپلٹی اور صحت کا ڈاکٹری سرٹیفکیٹ مع خون پیشاب کے ٹیسٹ بھیجنا چاہیے تاکہ مخاطب انکار نہ کر سکے۔ عمر ہمیں بھی ان صاحبوں کی معلوم نہیں صرف قرائن سے ستر سے بہتر لگتے ہیں ممکن ہے اس سے بھی آگے کو پہنچے ہوئے ہوں۔ صحت کا یہ ہے کہ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ صبح گئے یا شام گئے ڈاکٹر گھنٹوں دل پر ٹوٹی لگائے بیٹھا رہتا ہے یا یکا یک ہوشیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ خم ٹھونک کر پکار اٹھتے ہیں۔ نکالو تو کدھر ہے بلی۔

پہلے آپ بھی ہمارے آداب اور تہذیب کا ایک لازمہ ہے جانے کتنے لوگوں کی گاڑیاں اس میں نکل گئیں۔ دوسرے کو بٹھا کر خود کھڑے رہنا بھی سعادت مندی اور شرافت کی دلیل ہے لیکن لوگ ان آداب کو بھولتے جا رہے ہیں۔ انگریزوں کے ہاں سے خواتین کو اپنی نشست پیش کرنے کی رسم اٹھتی جا رہی ہے۔ ہٹے کٹے لوگ بھد سے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں پھر غنیمت ہے کہ کوئی خوب صورت لڑکی ہو نہ صرف اس کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں، بس میں بھی اور جگہ بھی بلکہ کاندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے بھی ہیں۔

زمانہ شجاعت کی اکثر کہانیاں اور روایتیں جھوٹ سہی، لیکن ہائے کتنی اچھی تھیں۔ جنگجو لوگ پہلے مخالف کو وار کرنے کی دعوت دیتے تھے کہ پہلے آپ وہ بھی نسب کا اصیل ہوتا تھا۔ پہلے آپ ... اس میں شام ہو جاتی تھی اور آگے کی تاریخ پڑ جاتی

تھی۔ یا یہ ہوتا تھا کہ جوان میں سے زیادہ سمجھدار ہوتا تھا۔ دوسرے کو غافل دیکھ کر اس کی بات پر سر تسلیم خم کر کے اس کی بغل میں تلوار گھونپ دیتا تھا اور دوسرا تڑپتا، پچھتاتا، شجاعت کے اصولوں پر نفریں بھیجتا اپنی بیوی کو بیوہ کرتا اور بچوں کے سر سے اپنا سایہ اٹھتا۔ خدا کی رحمت کے سائے میں پہنچ جاتا تھا۔ انہی لوگوں سے وضعداری کی ذرین روایتیں قائم تھیں۔ آج کے لوگوں سے آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ طبل جنگ بج رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے سبھی ممبر چھتریاں لگائے کالے چشمے پہنے تھرماس کندھے سے لٹکائے ہمہ تن اشتیاق کھڑے ہیں اور امریکہ اور روس اپنے ہاتھ میں ہائیڈروجن بم لیے آمنے سامنے کھڑے تکلف کر رہے ہیں

''اجی پہلے آپ''۔''اجی پہلے آپ''

پیارے یہ ہمیں سے ہوا ہر کارے و ہر مردے

☆☆☆☆☆

سوامی جی لندن میں

یوں تو لندن میں ایک سے ایک یوگی ، ایک سے ایک سوامی ایک سے ایک ہرڈ یو یو بھرا پڑا ہے مثلاً آج ہی ماربل آرچ سے ہرے کرشنا والوں کا جلوس ڈھول ڈھمکے سے نکلے گا جو ناچتا گاتا اشلوک اور منتر پڑھتا ٹریفالگر اسکوائر تک جائے گا۔ لیکن ایک تازہ وارد سوامی ان سب سے بازی لے گئے ہیں۔ انہوں نے ابھی پچھلے دنوں قدم رنجہ فرمایا ہے اور ایسے پکے برہمچاری ہیں کہ عورت کو بری کیا اچھی نظر سے دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ بمبئی سے ہوائی جہاز میں آئے مع اپنے نوحواریوں کے، تو حکم تھا کہ کوئی ایرہوسٹس ادھر تشریف نہ لائے۔ فسٹ کلاس میں ایک طرف کو پردہ کیئے بیٹھے رہے۔ لندن میں بھی یہی حکم تھا کہ کسی عورت سے آمنا سامنا نہ ہو۔ ہوائی اڈے والوں کو خاص انتظام کرنا پڑا ہوائی اڈے کیا شہر بھی آئے تو آنکھیں موٹر کے فرش پر گاڑے رہے۔ کھڑکی سے باہر نہ جھانکا۔ اب بھی شہر سے باہر ایک سنسان مقام پر مقیم ہیں۔ جہاں استری جاتی کا گزر نہیں ہے۔ آپ ہیں سوامی نرائن فرقے کے گوروشری پرکھ سوامی شاستری شری ،لندن کے سارے اخباروں نے ان کی تصویریں چھاپی ہیں۔ خشخشی داڑھی۔ سر پر زعفرانی پگڑی۔ صحت ماشاءاللہ اچھی بلکہ زیادہ ہی اچھی۔ چنگا چوسا کھاتے ہوں گے۔

ہائے اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ سوامی جی کی عمر دم تحریر ۶۵ سال ہے اور ۱۷ برس کے تھے جب یہ گورو بنے اور وہ دن اور آج کا دن برہمچریہ کے مارے عورت کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ حالانکہ سترہ برس کی عمر جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کی عمر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ تو اس وقت دو تین کی حد تک صاحب اولاد ہو چکے ہوتے ہیں اور اندرا گاندھی کے زمانے میں بعضوں کی تو نس بندی تک کر دی جاتی تھی۔ دور کیوں جائیے ہم اپنا ہی مقابلہ شری سوامی جی سے کرتے ہیں کہ ہمیں نادم ہونا چاہیے یا خوش ہونا چاہیے کیونکہ سوامی جی نے سترہ کی عمر کے بعد سے عورت پر نظر نہیں ڈالی اور ہم نے سترہ برس بلکہ اس سے پہلے سے شروع کر کے کسی اور چیز کو در خور اعتنا نہ سمجھا عورت پر نہ صرف نظر ڈالی کبھی کبھی اچھی لیکن زیادہ تر ویسی جیسی ڈالنی چاہیے بلکہ اسے اعصاب تک پر سوار کر لیا۔ جس کی شکایت علامہ اقبال مرحوم تک کو ہوئی۔ حالانکہ قرائن کہتے ہیں ایک زمانے میں خود ان کے اعصاب کے تقاضے زیادہ مختلف نہ تھے۔ کسی کی گود میں بلی دیکھ لیتے تھے تو اس پر نظم لکھ دیتے تھے۔ بلی پر نہیں۔ وہ تو بے چاری معصوم چیز ہے جس پر زیادہ سے زیادہ ہاتھ پھیرا جا سکتا ہے ، بلکہ اس پر آپ سمجھتے ہیں نا۔

سوامی جی جمبو جیٹ طیارے میں آئے اور اکانومی کلاس میں ہماشا کے ساتھ نہیں، فرسٹ کلاس میں بیٹھ کے آئے۔ یہ بھی ہندوستان میں روحانیت کے لوازم میں سے ہے۔ مشہور مصنف ویدمہتہ نے پچھلے دنوں گاندھی جی پر ایک کتاب لکھی ہے جس کی آج بھی بڑی تعریف ہو رہی ہے خود انہوں نے گاندھی جی کی بڑی تعریف کی ہے بس ایک دو باتیں لکھ گئے ہیں جو ہم بوجہ مہاتما جی کے احترام کے لکھنے کی جرات نہ کرتے۔ ایک یہ کہ ان کو غریبی کی حالت میں رکھنے پر بڑا پیسہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً" سفر تھرڈ کلاس میں کرتے تھے۔ بکری سمیت تو پورا ڈبہ ریزرو ہوتا ہے۔ سیکنڈ یا فرسٹ کلاس کی سیٹ اس سے سستی رہتی۔ پھر محض یہ آزمانے کے لیے کہ انہوں نے اپنے نفس کو کچل دیا ہے۔ جوان جہان لڑکیوں کو ساتھ لٹاتے تھے۔ ہماری پرانی داستانوں میں ایسے موقع پر ہیرو نامحرم لڑکی کے ساتھ لیٹنے کے موقع پر رفع شر کے لیے درمیان میں تلوار رکھ لیتا تھا۔ لڑکی کے جز بز ہونے کی پروانہ کرتا تھا۔ گاندھی جی تلوار کیا چھڑی تک درمیان میں نہ رکھتے تھے، بس اپنی روحانیت کے سر پر شیطان کے شر سے محفوظ رہتے تھے۔ اس

معصوم لڑکی کو بھی جس کی روحانیت مہاتما جی کے عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی تھی ،کوئی اور گھر ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ ایک زمانے میں ایک اردو شاعر کی نظم پڑھی تھی- یہ ان مصرعوں پر ختم ہوتی تھی

میں کنوارا ہی رہا

کاش میرا باپ بھی

...... ہمیں معلوم نہیں- ان سوامی جی کو بھی افسوس ہوتا ہے یا نہیں کہ میرے باپ بھی سوامی نرائن فرقے کے برہمچاری کیوں نہ ہوئے -اگر وہ ناخلف نہیں تو ایسا احساس ہونا ضرور چاہیے- اس وقت سوامی جی کے چیلوں کی تعداد دس لاکھ بتائی جاتی ہے- ان میں کچھ ایسے ضرور ہوں گے جو اندھیرے اجالے میں چوکتے نہ ہوں گے- تاہم ایک بڑی تعداد نے از خود اپنی نفسانی نس بندی کر رکھی ہے- اے کاش اندرا گاندھی ڈاکٹروں کو مخلوق کے پیچھے لگانے کی بجائے سوامیوں کو لگائیں اور جبری نس بندی کا الزام اپنے سر نہ لیتیں- ممکن ہے اس وقت تک خود وہ بھی قائل ہو گئی ہوں کہ سنجے جیسے نونہالوں کو وجود میں لانے کی نسبت سوامی نرائن فرقے کا پیروکار رہنا بہتر ہے- سنجے گاندھی کو تو ہم ناخلف نہیں کہہ سکتے- ان کے بزرگوں کو اس لحاظ سے ناخلف کہا جا سکتا ہے- بہر حال بات سوامی جی کی ہے جو انگریزوں کو روحانیت سے مالا مال کرنے کے لیے اگست تک کے لیے برطانیہ آئے ہوئے ہیں- ہزاروں لاکھوں لوگ اور بھی آتے ہیں لیکن اس سے برعکس مقاصد لے کر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں قسموں کے لوگوں میں سے کس سے خطاب کر کے کہیں کہ ع

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

کیونکہ ہمارا مسلک بابا شراب خوردن و بہ زاہد نماز کردن کا ہے- ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ ہم فلموں میں بے حیائی کے بہت خلاف ہیں-ایک فلم اس قسم کی تھی چنانچہ ہم سارا وقت نظریں فرش پر گاڑے کان ہی کان میں نکالے سنتے اور منہ ہی منہ میں لاحول پڑھتے بیٹھے رہے- جب فلم ختم ہوئی تو ایک صاحب نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے ہم سے کہا- حافظ جی آپ کو باہر چھوڑ آؤں- جی تو چاہا کہ اس کی خوب سی خبریں لیں کہ اندھے تو تم ہو جو ایسی شرمناک فلمیں دیکھنے آتے ہو- ہم اندھے نہیں- ہماری آنکھیں نورِ بصیرت سے روشن ہیں- پھر درگزر کیا کہ عامی لوگ انہی کی حمایت کریں گے- ہمیں معلوم نہیں سوامی جی پر بھی لوگوں نے ایسا گمان کیا ہے یعنی ان کو آنکھوں کا معائنہ کرانے اور ممیرے کا سرمہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے یا نہیں-

☆☆☆☆☆

کیلے دکیلے کا خدا حافظ

آپ نے کبھی کیلا دیکھا ہے۔ کھایا ہے۔ کھایا نہیں تو کبھی اس پر پھسلے ضرور ہوں گے۔ پھسلتا بھی آدمی اچھی چیز پر ہے۔ ہماری مثال لیجئے۔ جہاں اچھی صورت دیکھی، بری طرح اس پر پھسل گئے۔ جو اچھی صورت پر نہیں پھسلتے، پیسے پر پھسل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے پیسہ بھی اچھی چیز ہے بلکہ انصاف یہ ہے کہ اچھی صورت سے زیادہ اچھی چیز ہے کیونکہ پیسہ ہے تو اچھی صورت بھی اس سے حاصل کر سکتے ہیں جبکہ اچھی صورت بعض اوقات پیسے کے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ بہر حال مقصود گفتگو کا یہ کہ کیلے کو کسی طرف سے دیکھئے، کسی طرف سے کھایئے، کسی طرف سے اس پر پھسلئے، اچھی چیز ہے اور بھی پھل ہیں زمانے میں کیلے کے سوا لیکن انہیں محض دیکھ سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ دکھا سکتے ہیں، ان پر پھسل نہیں سکتے۔

برطانیہ کے ایک اخبار نے ایک لمبا چوڑا مضمون چھاپا ہے جس میں برطانیہ کی معاشی بدحالی کی وجہ آخر دریافت کر لی ہے۔ اس سے پہلے ایک پرانا لطیفہ سنیئے۔ ٹریفالگر اسکوائر میں ایک لمبی لاٹ کے اوپر نیلسن کا بت ہے۔ امیر البحر نیلسن کا شمار برطانیہ کے قومی ہیروؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے کیا کیا تھا وہ ہم بھول گئے ہیں کیونکہ اس کے کارنامے ہم نے میٹرک کی جماعتوں میں پڑھے تھے اور امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی فراموش کر دیے تھے۔ بہر حال اگر وہ ہیرو نہ ہوتا تو اس کا بت اتنی نمایاں جگہ پر کیوں نصب کرتے۔ اتفاق سے ایک غیر ملکی سیاح ادھر آ نکلا اور اس نے بت کی طرف اشارہ کر کے ایک انگریز سے پوچھا کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔ اس نے چھاتی پھلا کر کہا۔ یہ نیلسن کا مجسمہ ہے۔ وہ کوئی سادہ لوح تھا بولا۔ نیلسن کون۔ انگریز نے بہت حیران ہو کر کہا۔ نیلسن کو نہیں جانتے۔ آج جو کچھ تم اس ملک میں دیکھ رہے ہو اسی کی بدولت تو ہے۔ اس کا اشارہ تو ضرور برطانیہ کی عظمت وغیرہ کی طرف ہو گا لیکن سیاح کا رجحان اقتصادیات کی طرف زیادہ تھا۔ چچ چچ کر کے ملامت کے لہجے میں انگریز بہادر سے کہنے لگا کہ سارا الزام ایک آدمی کے سر ڈال دینا زیادتی کی بات ہے۔

اب آیئے بر سر مطلب۔ اس اخبار نے برطانیہ کی معاشی بدحالی کا سارا الزام کیلے کے سر ڈال دیا ہے۔ یہ بھی ایسی ہی زیادتی ہے۔ ایسے میں ہمارے ہاں طویلے کی بلا بندر کے سر ڈالنے کا محاورہ ہی ہے حالانکہ بندر اور کیلے میں کوئی نسبت نہیں سوائے اس کے کہ بندر بھی کیلا شوق سے کھاتا ہے۔ آخر انسان کا مورث اعلٰی ہے۔ ہم نہ مانیں انگریز تو مانتے ہیں۔

بہر حال انگریز کیلا رغبت سے کھاتا ہے اور تھوڑا بہت نہیں سال کے سال تین لاکھ ٹن ہڑپ کر جاتا ہے اور یہ سارے کا سارا باہر سے آتا ہے۔ انگریز کے ہاں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ جمہوریت کے باوجود بادشاہت تک ہوتی ہے۔ لیکن کھانے کی زیادہ تر چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ معلوم ہے کھانے کی چیزوں کی درآمد پر انگریز سالانہ کتنے پیسے خرچ کرتا ہے۔ ساڑھے چار بلین پونڈ۔ ملین نہیں کی فی زمانہ امریکیوں کی مہربانی سے معمولی چیز ہو گئی ہے بلکہ بلین۔ مساوی ایک سو ملین۔ اگر ہمارا حساب ٹھیک ہے تو یہ ۴۵ کروڑ پونڈ بنتے ہیں جو پونڈ سستا ہونے کے باوجود ہمارے سکے میں سات ادب ۶۵ کروڑ روپے کے برابر ہے جس کا نصف بھی بہت ہوتا ہے۔ اس درآمد کے باعث برطانیہ کا توازن ادائیگی ڈانواڈول بلکہ اکثر خسارے کی طرف رہتا ہے اور ورلڈ بنک کے سامنے کشکول پھیلانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کھانے کی چیزیں مکھن وغیرہ تک باہر سے آئیں گی تو مہنگی بھی ہوں گی۔ چنانچہ غذائی اشیاء کی مہنگائی کے باعث یہاں کے گھروں میں بابا کار بھی مچتی ہے۔ کارٹون میں مبالغہ تو ہوتا ہی ہے لیکن ذرا یہ کارٹون

دیکھئے کہ چار آدمیوں کی سیٹ پر بس میں آٹھ آدمی بیٹھے ہیں۔ بچاروں کی فاقے کرتے ہڈیاں نکل آئی ہیں اور کنڈکٹر جو خود جانے کس چکی کا پسا کھاتا ہے محظوظ ہو کر کہہ رہا ہے کہ خدا کی شان ہے کبھی اس سیٹ پر تین آدمی پھنس کر بیٹھا کرتے تھے۔

اخبار والے نے حساب لگایا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں پانچ کروڑ پونڈ یعنی پچاس کروڑ روپے کا کیلا آیا۔ کیوں آیا۔ کیا ہم کیلے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تو چائے بھی بند کرنی چاہیے تھی جو ہماری خوشحالی کے دنوں کی یادگار ہے۔ جب سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ مقبوضات سے مفت آجاتی تھی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ سلطنت کی بات تو کیا کیجئے کہ رفت گزشت ہوئی۔ اب تو کبھی کبھی اندرون ملک بھی سورج طلوع نہیں ہوتا پھر یہ کہہ کر چائے تو ہم نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ اس کے بغیر کوئی دفتر نہیں چل سکتا ،فیکٹری نہیں چل سکتی اور کافی اس سے زیادہ مہنگی ہے لیکن کیلے کی درآمد پرتگال اور یونان نے بند کر دی ہے تو ہم بھی کیوں نہ کریں۔ اس کا ذائقہ بھی کچھ ایسا نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بھیگا ہوا بلاٹنگ پیپر منہ میں رکھ لیا جائے۔ تھوڑا سا میٹھا ڈال کر اس سے زیادہ غذائیت تو ہمارے آلو میں ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں پرتگال اور یونان کی معیشت کا زیادہ علم نہیں لیکن خیال یہ ہے کہ وہ کیلا نہ کھانے کے باوجود بہت مضبوط نہیں ہے۔ برطانیہ سے بہتر نہیں ہے۔ پھر نزلہ اس عضو ضعیف پر گرانے کا فائدہ۔

اب سوال یہ ہے کہ جن ملکوں کی معیشت کا دارومدار بڑی حد تک کیلے کی برآمد پر ہے وہ کیا کریں۔ اخبار والے نے اس میں بھی خوبی کا نکتہ دریافت کر لیا ہے کہ وہاں سے کیلا نہ آئے گا تو وہاں کے لوگوں میں غریبی اور بدحالی پھیلے گی اور وہاں انقلاب آئے گا اور مساواتی نظام رائج ہوگا لیکن لکھنے والوں نے دو نکتے نظر انداز کر دیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انقلاب والے ملکوں میں بھی آدمی سارا وقت کیلا کھا کا گزارہ نہیں کر سکتا اور دوسرا یہ کہ انقلاب اچھی چیز ہے تو اسے اپنے ہاں کیوں نہ لایا جائے بلکہ کیلے اور دوسری برآمدات کو گھٹانے کی بجائے دگنا چوگنا کر لیا جائے معاشی بدحالی جلد نقطۂ عروج کو پہنچے گی اور انقلاب اور مساواتی نظام کل کے آتے آج آئیں گے۔

☆☆☆☆☆

دانت کا درد

ایک ان ہی کا بھلا ہو ہمیں منظور نہیں

یہ کیسے مسیحا ہیں ، دوا کیوں نہیں دیتے

یہاں اخبار میں کسی کا مراسلہ چھپا ہے کہ صاحب اگر کسی کے دانت میں ہفتے یا اتوار کو جب ڈاکٹروں کی چھٹی کا دن ہوتا ہے ، درد اٹھے تو وہ کیا کرے۔ یہاں اسپتال ضرور ہیں جو ایمرجنسی کے کیس لیتے ہیں لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کا جبڑا ٹوٹ گیا ہو تو بسم اللہ آیئے۔ دانت کا درد کوئی ایمرجنسی نہیں ہے اسے ہم قبول نہیں کرتے۔

ایک بار ہم نے اپنے ملک میں کسی اسپتال میں یہ لکھا دیکھا تھا کہ یہاں ۹ بجے سے پانچ بجے تک کتوں کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے۔ ہم نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کو کتوں سے صرف ان ہی اوقات کے اندر کٹوائیں کہ یہ ان ہی کے مفاد کی بات ہے ، کٹوانے والوں کے مفاد کی کتوں کے مفاد کی نہیں۔ پھر کسی بھلے مانس نے سوال اٹھایا کہ یہ مشورہ کتوں کو دینا چاہیے کہ وہ صرف ان اوقات کے اندر کاٹیں۔ لیکن اس میں چند در چند قباحتیں تھیں۔ سارے کتوں کو گھڑیاں یا ٹائم پیس فراہم کرنے پڑتے یا روزانہ نو بجے اور پانچ بجے توپ چلانی پڑتی یا سائرن بجانا پڑتا پھر بھی کوئی ضروری نہیں کہ کتے بات سمجھتے۔ اخباروں میں اعلان کیا جا سکتا تھا ، پوسٹر چھاپے جا سکتے تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے کتے تعلیم یافتہ نہیں ہیں جس ملک میں اٹھارہ فیصدی انسانوں کی تعلیم کی اوسط ہو اس میں کتوں کی تعلیم کا زیادہ بندوبست مشکل ہے۔ ہم کبھی وزیر تعلیم بنے تو ادھر توجہ کریں گے۔ یہ بات نہیں کہ سبھی کتے ان پڑھ ہوتے ہیں جن لوگوں نے دکانوں پارکوں کے باہر نوٹس لگا رکھے ہیں کہ یہاں کتوں کا داخلہ منع ہے۔ وہ بیوقوف نہیں ہیں۔ ہم نے خود بعض کتوں کو دیکھا ہے کہ دم لہراتے ذوق وشوق سے آئے اور جہاں یہ نوٹس دیکھا ، پابند قانون شہریوں کی طرح اپنا سامنہ لے کر اور دم ڈھیلی کرے واپس چلے گئے۔

پس ہم یہاں ولایت کے مریضوں کو مشورہ دیں گے کہ ہفتے کو دانت کا درد نہ اٹھنے دیں پیر کا انتظار کریں۔ بلکہ منگل کا یہاں یہ دستور نہیں کہ آپ بیمار ہوئے تو اٹھ کے قارورے کی شیشی لے کر حکیم کے پاس یا ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ یہاں فون کر کے پہلے اپوائنٹمنٹ لیجئے۔ ہمارے ساتھ کئی بار ہو چکا ہے کہ شدید درد اٹھا یا کھانسی لاحق ہوئی ، گلا سوج گیا۔ ہمارے ڈاکٹر کی سیکرٹری نے بہت کہا کہ کل تک حالت اور بگڑ جائے گی ۔ لیکن اصول اصول ہے۔ ہمارے ملک کی طرح بے اصولی نہیں کہ ڈاکٹر نے بے وقت بھی دیکھ لیا اور دوا دے دی۔ پھر یہاں ڈاکٹر کے پاس دوا نہیں ہوتی۔ صرف اسٹتھکوپ اور مشورہ ہوتا ہے۔ پرچی لکھ دیتا ہے کہ فلاں اسپتال جاؤ اور ایکسرے کراؤ اور پھر فون کر کے وقت لے آؤ یا کیمسٹ سے یہ دوا بنوا لو۔ جب ہفتہ یا اتوار ہوتا ہے تو یہ بیمار سخت لاچار ہوتا ہے۔ ع

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہے

ہمارے ہاں عطائیوں کا دم غنیمت ہے کہ ڈاکٹر کی چھٹی ہو تو مریض کی دستگیری کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے قبرستان تک پہنچا آتے ہیں۔ لیکن عام حالات میں مریض کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ دوا تو ملی۔ آگے شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دینے والے نے گڑ

نہ دیا۔ گڑکی سی بات تو کی۔

دانت کا درد بڑی ظالم چیز ہے لیکن دانت کا ڈاکٹر اس سے بھی ظالم چیز ہے۔ ہم یہاں کی بات کر رہے ہیں ، اپنے ملک کی نہیں۔ جہاں دانت نکالنے کے لیے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے زنبور ڈال کر نکال دیتے ہیں اور جہاں لکڑ ہضم پتھر ہضم قسم کے منجن ہر جگہ دستیاب ہیں۔ یہاں ہمارے ایک دانت میں تکلیف ہوئی ، ہم اس کے پاس گئے۔ یہاں کے دانتوں کے ڈاکٹر دوا وغیرہ نہیں جانتے۔ ہمیں تب ہوش آئی جب انہوں نے ایک ساتھ ہمارے تین دانت نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ہم نے کہا ان دو کا کیا قصور ہے۔ ان میں تو درد نہیں ہوتا تھا ، ڈاکٹر تھا ، دور اندیش قسم کا بولا آج نہیں تو پھر کبھی ضرور ہوتا۔ اب سن کرنے کے ایک انجکشن لگانا پڑتا۔ آپ کو تکلیف ہوتی۔ ہم قائل ہو گئے۔ بلکہ ہونا پڑا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ دانت تو وہ دوبارہ ہمارے جبڑے میں ٹھونک نہ سکتا تھا۔

ہم لکھ چکے کہ یہاں عربوں کی ریل پیل ہے۔ ہمارا محلہ عین مرکزی لندن میں آکسفورڈ اسٹریٹ کے پاس ہے۔ شام کو پوری سڑک پر مرد ، بچے ، بوڑھے چوغے پہنے سڑک پر گھومتے اور دکانوں میں خریداری کرتے نظر آتے ہیں اور عورتیں کالے برقعے پہنے ، ناک پر چونچیں لگائے یا بغیر برقعے کے دروازوں کھڑکیوں ، سیڑھیوں میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ہم نے آج کل عربی پڑھنی شروع کر دی ہے۔ آخر لندن میں رہنا ہے چونکہ عرب کا مطلب کروڑ پتی ہوتا ہے لہذا ہر چیز کے دام چڑھ گئے ہیں اور ڈاکٹروں کی بھی چاندی ہوگئی ہے بلکہ سونا کہیے حتی کہ متحدہ عرب امارات کے میڈیکل اتاشی ڈاکٹر جمعہ بلال نے کل خبردار کیا کہ اگر ڈاکٹروں نے لوٹ کھسوٹ جاری رکھی تو ہمارے ہاں کے لوگ علاج کے لیے دوسرے یورپی ممالک جرمنی وغیرہ جانے لگیں گے۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا۔ ع

ع تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو۔

ڈاکٹر بلال نے بتایا کہ دانتوں کے ایک ڈاکٹر نے ایک عرب مریض کو ساڑھے تین ہزار پونڈ کا بل دیا اور ایک ظالم نے تو دس ہزار پونڈ یعنی ہمارے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا بل بنا دیا۔ ڈاکٹر بلال نے کہا کہ یہاں کے عام ڈاکٹر ایسے دندان شکن بل نہیں دیتے۔ جتنا دانتوں کے ڈاکٹر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو دل کا عارضہ ہو تو اس کی سرجری کا بل اس سے تہائی یا چوتھائی ہوتا ہے۔

ہمارا مشورہ آج تک کسی نے مانا نہیں ورنہ ہم یہاں آنے والے مریضوں کو مشورہ دیتے کہ وہ اپنے دل کا علاج کرا لیں۔ خواہ درد ان کے دانت ہی میں کیوں نہ ہو کیونکہ سستا پڑے گا اور جیسا کہ ہمارے دندان ساز نے ہمیں دلاسا دیا تھا۔ ہم بھی کہیں گے کہ دل میں آج نہیں تو کل درد ہو سکتا ہے۔ آج کل دل کی بیماریاں عام ہیں۔ پس کیوں نہ آج ہی دور اندیشی سے کام لیا جائے۔ دانتوں کا کیا ہے۔ ہوئے ہوئے ، نہ ہوئے ، نہ ہوئے۔ آخر بعض جانور بغیر دانتوں کے بھی ہوتے ہیں مثلا ، " مثلا" ہمیں اس وقت صرف جونک یاد آتی ہے اور بھی ہوں گے۔ حکمت یعنی علم طب میں دور اندیشی بڑی ضروری چیز ہے۔

ایک صاحب کے پیٹ میں درد تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ جلی ہوئی روٹی کھالی تھی۔ انہوں نے ان کی آنکھ میں دو دو قطرے دوا کے ڈال دیے۔ مریض نے کہا حضرت درد تو پیٹ میں ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ آنکھوں کا علاج مقدم ہے۔ کیونکہ تجھے یہ نظر نہیں آیا کہ روٹی جلی ہوئی ہے۔ بیماری میں دور اندیشی کے اور بھی مقامات آتے ہیں ایک صاحب نے کہ بیمار تھے اپنے نوکر کو بھیجا کہ حکیم صاحب کو لے آؤ۔ وہ حکیم صاحب کو لے آیا اور دو اور آدمیوں کو بھی جن میں ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان اور دوسرے کے کاندھے پر پھاوڑا تھا۔ مریض نے کہا یہ تو حکیم صاحب ہوئے۔ ان دو صاحبوں کی تعریف۔ نوکر بولا۔ حضور یہ کفن سینے والے ہیں اور یہ گورکن ہیں۔ یوں تو حکیم صاحب بڑے صادق ہیں اور ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ پھر بھی دور اندیشی اور احتیاط کا تقاضا تھا کہ.........

آغاز تاریخ انگلستان کا

جدید اردو ریڈر ،حصہ دوم

عزیز طالب علمو! آؤ آج تاریخ انگلستان کا مطالعہ کریں۔

انگلستان کی تاریخ کا کچھ مطالعہ ہم نے ہائی اسکول کے دنوں میں بھی کیا تھا۔ لیکن جلد ہی بیزار ہو گئے تھے کیونکہ اس میں اتنے سارے ایڈورڈ اور جارج اور ہنری آتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے جیمس اور چارلس اور رچرڈ اور جان وغیرہ اس پر مستزاد اور ملکائیں اس کے علاوہ۔ انگریزوں کو بادشاہ تو ملتے تھے لیکن ان کے نام نہیں ملتے تھے۔ لہذا ایک دو نام لے کر ان پر نمبر شمار ڈالتے رہتے تھے -ہمارے ہاں ہمنامی کا چکر زیادہ نہیں۔ یوں خاندان مغلیہ کے آخری دنوں میں ایک آدھ اکبر شاہ یا اکبر ثانی ہوا یا ایک دو سال عالم یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ورنہ بادشاہ کیسا بھی ہو نام اس کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ اور فصیح و بلیغ لاتے تھے۔ فرخ سیر، رفیع الدولہ ، رفیع الدرجات وغیرہ -انگلستان کے بادشاہوں میں بہت سے جارج ایڈرڈ اور ہنری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ کارنامے بیان کرنے لگیں تو وہ کیے ہوتے ہیں کسی داڑھی والے نے اور پکڑا جاتا ہے مونچھوں والا۔ آپ نے انگلستان کے بادشاہوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ ان میں کئی داڑھیوں والے تھے۔ کئی محض مونچھوں والے اور بعض صرف سر پر پٹے رکھتے تھے وہ بھی ہمیشہ اصلی نہیں بلکہ اکثر مصنوعی ان میں ہنری ہشتم کی آٹھ بیوائیں تھیں لیکن اس سے یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ اس وجہ سے وہ ہشتم کہلاتا تھا اور ہنری ہفتم کی سات اور ہنری ششتم کی چھ زوجائیں ہوں گی۔ بعضوں کو تو ایک بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم ہی کو لیجیے بے چارے کو ایک بیوی کرنے کے لیے اپنا تخت تک چھوڑنا پڑا۔ وہ بھی امریکن اور پہلے سے بیاہی نکا حی۔ ہمارے اور انگلستان کے بادشاہوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انگلستان کا ایک ایک بادشاہ بیک وقت کئی کئی جگہ دفن ہے، سر کہیں، دھڑ کہیں، کان کہیں ناک کہیں ،دل کہیں ،کلیجہ کہیں وغیرہ وغیرہ۔ مقصود یہ تھا کہ مختلف جگہ ان کی مغفرت کی دعائیں کی جا سکیں۔ ان میں سے بعض کے اعمال بھی ایسے تھے کہ ایک آدھ جگہ مغفرت کی دعا کافی نہ پڑی۔

تاریخ انگلستان میں ہمیں زیادہ گہرا جانے کی ضرورت نہیں۔ خود انگریز بھی زیادہ گہرا نہیں جاتے۔ بلکہ کوئی بھی قوم اتنا گہرا نہیں جاتی جتنا ہم جاتے ہیں کہ بعض اوقات باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے کوئی کنڈا پھینک کر نکالے تو نکالے۔ دراصل کئی صدیاں تو اس ملک میں طوائف الملوکی کی رہیں۔ یہ نہیں کہ طوائفوں کا راج تھا بلکہ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کا معاملہ تھا۔ بھینس اس ملک میں زیادہ نہ تھیں۔ اب بھی نہیں لیکن لاٹھیاں خاصی تھیں۔ یا پھر شمالی یورپ کے وائی کنگ سر پر سینگ لگا کر (تاکہ کوئی ان کو گدھا نہ سمجھ لے) اور ہاتھوں میں کھانڈے لے کر ہر طرف خون خرابہ کرتے پھرتے تھے۔ ان دنوں یہاں کوئی اینک پاول نہ ہوتا تھا۔ نہ نیشنل فرنٹ کا زور تھا لہذا نہ صرف باہر سے کام یا مزدوری یا لڑائی کے لیے آنے والوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بلکہ یہاں کے لوگ انہی میں سے بعض کو بڑے ذوق وشوق سے بادشاہ بناتے تھے اور اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے -جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے انگلستان میں صحیح النسل انگریز بادشاہ کوئی بھی نہیں ہوا۔ یا تو ڈین یعنی اہل ڈنمارک نے راج کیا یا نارمن یعنی نارمنڈی کے -فرانسیسی آئے یا جرمنوں نے حکمرانوں کی انگلستان کا خود خاندان بھی جرمن نسل کا ہے انگلستان والے حسب نسب کے معاملے میں بھی عموما

"سیر چشمی، وسیع النظری اور درگذر سے کام لیتے تھے۔ ان کے کئی بادشاہ تو صاف حرامی تھے جس کی تصدیق مورخوں نے بھی کی ہے اور خود ان کے والدین کا بھی یہی بیان تھا مثلاً" ولیم فاتح ہیرالڈ اول بعض ان میں ماں کی طرف سے حرامی تھے۔ بعض باپ کی طرف سے اور بعض نجیب الطرفین یعنی دونوں طرف سے حرامی بھی تھے۔ جو لوگ حسب نسب کے لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھے وہ اپنی عمل اور کردار سے اپنے کو ایسا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس میں بالعموم کامیاب رہتے تھے۔

انگلستان کی تاریخ میں سب سے پرانا نام حکمرانوں میں ملکہ بوڈیشیا کا ملتا ہے۔ یہ پہلی صدی عیسوی کی بات ہے۔ یہ بڑی لحیم شحیم خونخوار ملکہ تھیں ان کے رتھ کے پہیوں میں تیز دھار چاقو کے پھل لگے رہتے تھے۔ جہاں سے رتھ گذرتا تھا لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جاتا تھا۔ انگلستان میں اور بھی کئی ملکائیں ہوئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا انتقال بستر میں ہوا۔ بعض کا اپنے بستر میں بعض کا کسی اور کے بستر میں ایک دو کا سر قلم کرنا پڑا۔ لیکن ملکہ بودیشیا چونکہ میگنا کارٹا سے بہت پہلے پیدا ہوئی تھیں اور بااختیار ملکہ ہونے کے ساتھ مرد میدان بھی تھیں۔ اس لیے جب ان کو رومنوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو انہوں نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔ اتنا زہر ان دنوں میسر نہ تھا کہ کسی اور کی تواضع اس سے کر سکتیں۔ ایسی غیرت مند ملکہ پھر انگلستان کی تاریخ میں کوئی نہ ہوئی۔

آپ نے کنگ آرتھر کا نام بھی سنا ہوگا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہوا ہی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں ضرور ہوا ہوگا۔ اس کی راؤنڈ ٹیبل یعنی گول میز مشہور ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مرحوم صدر ایوب نے ایجاد کی تھی یا اب سے چالیس پچاس برس پہلے انگریزوں نے سب سے پہلے گول میز بچھائی تھی اور اس پر سر آغا خاں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال وغیرہ کو بٹھایا تھا وہ غلطی پر ہیں اور تاریخ انگلستان سے بے بہرہ ہیں۔ سب سے پہلی گول میز کنگ آرتھر نے وہ خود ہوا ہو یا نہ ہوا بنوائی تھی اور اس کے گرد اپنے سرداروں سر لانسیلاٹ وغیرہ کو بٹھاتا تھا اور ان سے مذاکرات وغیرہ کرتا تھا۔ سر کا لفظ ہمارے خیال میں سردار ہی سے نکلا ہے۔ سرداروں میں سے جو لوگ بغاوت کر کے سوئے دار چلے جاتے تھے وہ کیفر کردار کو پہنچ جاتے تھے۔ جو سمجھدار تھے اور کوئے یار کی فضا کو ترجیح دیتے تھے وہ سر کا خطاب پاتے تھے۔ چنانچہ سر لانسیلاٹ سے لے کر سر چھوٹو رام تک یہ سلسلہ بخوبی چلا۔ ہاں خاں بہادر اور رائے بہادر وغیرہ ہمارے زمانے میں ایجاد ہوئے لیکن وہ بھی ایجاد کر گئے۔ انگریزوں کی واپسی پر یہ ایجادیں اپنے موجدوں کے ساتھ انگلستان آنے پر مصر تھیں لیکن انگریزوں نے اس معاملے میں تھوڑی بے مروتی بلکہ طوطا چشمی سے کام لیا۔ سروں یعنی سرداروں کے علاوہ کنگ آرتھر کے زمانے کی ایک مشہور شخصیت مرلن صاحب بھی تھے۔ یہ ان کے دربار کے جادوگر تھے اور الٹی مت دیتے تھے۔ اسی زمانے سے یہ رواج ہے کہ ہر بادشاہ کے ساتھ ایک مرلن ضرور لگا رہتا ہے جو بادشاہ پر ایسا جادو کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ جو کچھ کرتا ہے آنکھیں بند کر کے کرتا ہے حتٰی کہ قعرِ مذلت میں، یا کسی اور گڑھے میں جا گرتا ہے۔ مثالیں بہت ہیں لیکن ہمارے قارئین خود تلاش کریں آخر ان کا بھی تو کچھ فرض ہے۔

بادشاہی الفریڈ اعظم کی

پڑھنا لاطینی، جلانا کلچے، اور ایجاد کرنا لالٹین کا

گول میز والے کنگ آرتھر کے بعد انگلستان میں دوسرا مشہور بادشاہ الفریڈ ہوا ہے۔ اس کی میز کس شکل کی تھی، یہ تاریخوں میں مذکور نہیں۔ اسے الفریڈ اعظم بھی کہتے ہیں جس طرح سکندر اعظم کو سکندر اعظم، اکبر اعظم کو اکبر اعظم اور جنرل اعظم خاں کو خیر ان کا معاملہ دوسرا ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کو تحقیق کا موقع ملتا تو یہی [illegible] الفریڈ ہے یہ خاندان غلاماں کا کوئی شہزادہ تھا جو شوق تبلیغ میں تلوار مارتا ہوا

انگلستان جانکلا تھا۔ اتفاق سے اس بادشاہ کے شوق تبلیغ کا تاریخ میں ذکر ملتا بھی ہے جب اس نے ڈینش سردار گوتھرام کی شورش کو رفع کیا اور وہ پکڑا آیا تو الفریڈ نے اس کی گردن پر تلوار رکھ کر کہا کہ برضا و رغبت دین مسیحی کی حقانیت کا اقرار کرو ورنہ ابھی بھٹا سا سر اڑاتا ہوں۔ چنانچہ وہ صدق دل سے بلا جبر و اکراہ مسیحی ہو گیا اور خداوند خدا کی مناجات گانے لگا۔ اسے مزید پکا کرنے کے لیے شاہ ممدوح نے بپتسمہ کے بہانے اسے سمندر کے برفانی پانی میں غوطہ بھی دیا۔ بعد ازاں الفریڈ یعنی ہمارا شہزادہ الفرید اموی اسے مسلمان بھی ضرور کرتا جو عیسائیت کے بعد کا قدرتی مرحلہ ہے۔ (کسی کو ایک ہی حملے میں مسلمان نہیں بنا لینا چاہیے ورنہ گرم سرد ہو جاتا ہے) اگر گوتھرم کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور وہ بپتسمہ کی وجہ سے نمونیہ میں مبتلا ہو کر قبل از وقت خدا کی بادشاہیت میں داخل نہ ہو گیا ہوتا۔ یاد رہے یہ ہمارے سید ہاشمی مرحوم ہی تھے جنھوں نے کراچی کے بارے میں اس گمان کی تردید کی تھی کہ اسے کلاچی کے نام کے ایک مچھیرے نے اٹھارہویں صدی میں آباد کیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ بھلا مچھیرے بھی شہر بسایا کرتے ہیں۔ اسے ضرور محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے قریشیوں نے آباد کیا ہوگا اور قرشی نام رکھا ہوگا جو بگڑ کر کراچی ہو گیا۔ اتفاق سے صدر ایوب قریشیوں سے بہت گھبراتے تھے، انہیں اس تحقیق کا معلوم ہوا تو اپنا پایہ تخت کراچی سے اٹھ کر راولپنڈی لے گئے جس کے مزب کیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔

الفریڈ کے زمانے میں لوگ تعلیم کے مضر اثرات سے واقف تھے لہذا بچوں خصوصاً" شرفا اور روساء اور والیان مملکت کے بچوں کو اس سے حتی الوسع دور رکھا جاتا تھا۔ الفریڈ کے والد ماجد کنگ ایتھل وولف نے بھی اس کی کما حقہ، احتیاط کی چنانچہ الفریڈ بارہ سال کی عمر تک خواندگی سے مامون اور محفوظ رہا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس کی ماں دوسری قسم کی تھی۔ اس نے ایک روز چاروں بھائیوں کو اکٹھا کر کے ان کو کہانیوں کی ایک مصور قلمی کتاب پڑھ کر سنائی اور کہا تم چاروں میں سے جو پڑھنا سیکھے گا ایک کتاب اسے انعام میں ملے گی۔ باقی تین بھائی سمجھ دار تھے لیکن الفریڈ لالچ میں آ گیا۔ اس نے صرف لاطینی زبان ہی نہیں سیکھی بلکہ اپنی مادری زبان انگریزی بھی پڑھی۔ الفریڈ کے تین بھائیوں کا بعد میں کیا ہوا اس کا ذکر انگریزی تاریخوں میں بہت آیا لہذا قارئین کرام کو اپنے خاندان مغلیہ کے کسی بھی بادشاہ کے بھائیوں کا حال پڑھ لینا چاہیے۔

الفریڈ نے اپنی زندگی میں بہت سی لڑائیاں لڑیں اور بہت سے شورہ پشت باغیوں کی سرکوبی کی۔ یاد رہے کہ گکھڑ کسی نہ کسی نام سے ہر ملک میں ہوتے ہیں جب سب دشمن مطیع ہو گئے، کوئی نہ رہا جسے زک نہ دے سکتا اور تیغ کے گھاٹ اتار سکتا تو اس نے لوگوں کو قلم کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا اور لاطینی کی کچھ آسان آسان کتابیں لے کر ان کا مشکل مشکل انگریزی میں ترجمہ کیا، لیکن اسے پبلشر کوئی نہ ملا حالانکہ آج کا زمانہ ہوتا تو نہ صرف مقامی پبلشر بلکہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس والے بھی دوڑے دوڑے آتے اور اس کتاب کے افتتاحی جلسے نیشنل سنٹر میں ہوتے اور ان کتابوں کا بہت سی زبانوں میں حتی کہ واپس لاطینی میں بھی ترجمہ کیا جاتا کوئی پبلشر ملا بھی تو اس نے عذر کیا کہ جہاں پناہ ہم کتابیں کیسے چھاپیں ۔ابھی تو کیکسٹن نے چھاپہ خانہ ہی ایجاد نہیں کیا۔ کہتا ہے پندرہویں صدی کے آخر میں کروں گا۔ آپ چار صدیاں انتظار کرنا چاہیں تو مسودے چھوڑ جائیں ،اس میں بھی مصلحت خداوندی تھی۔ چھاپہ خانہ ہوتا تو ساری رعایا کو ناحق یہ کتابیں پڑھنی پڑتیں۔ انگلستان میں اسکول بھی سب سے پہلے الفریڈ ہی نے قائم کیے۔ لیکن زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ انہیں نیشنلائز بھی کر سکتا۔

الفریڈ کا سب سے بڑا کارنامہ جو کتابوں میں آیا ہے یہ ہے کہ اس نے ایک بڑھیا کے کیک جلا دیے تھے۔ کیک تو کیا ہوں گے ،روٹیاں یا کلچے ہوں گے۔ ہوا یوں کہ بادشاہت کے ابتدائی دنوں میں دشمنوں نے ایکا کر کے اس کی افواج قاہرہ کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا اور خود اس کی جان کے درپے ہوئے۔ ہر چند کہ ہمارا ممدوح بہت نڈر اور بے خوف تھا تاہم چوٹ پیٹ کے ڈر سے بھیس بدل کر جنگل میں ایک دہقان کے جھونپڑے میں جا چھپا۔ دہقان کی بڑھیا نے اسے دلاسا دیا اور کہا لے بیٹے میں روٹیاں توے پر ڈالتی ہوں تو ذرا انہیں سینک دے۔ لیکن آنچ کا خیال رکھنا اور پلٹتے رہنا۔ اب پکانا ریندھنا کوئی بادشاہوں کا کام ہے۔ الفریڈ تو تخت پر فروکش ہو گئے اور الٹے سیدھے حکم

دینے لگے یا آرڈی نِنس نکالنے لگے ،اس کے لیے تجربہ اور آنچ کی پہچان چاہیے۔ ہمارے بادشاہ سلامت اپنے خیالوں میں مگن بیٹھ رہے ۔مورخوں کا کہنا ہے کہ رعایا کی فکر میں منہمک تھے لیکن یہ دریافت نہیں ہوسکا کہ مورخوں کو اس کا کیسے علم ہوا۔ بہرحال روٹیاں جل گئیں اور اس نیک بی بی نے اسے بہت سخت سست کہا کہ بڑا بادشاہ بنا پھرتا ہے۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ اس کے بعد سے یہ ڈگر بن گئی کہ جو بادشاہ آیا اس نے رعایا کی روٹی ضرور خراب کی یا تو جلادی یا کچی چھوڑ دی یا اس میں کنکر ڈال دیے یا پھر سیدھے سیدھے چھین کے اپنے مال خانے میں بھجوادی کہ تم لوگ اسے کیا کرو گے۔ بھلا روٹی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اس کے کھانے سے نفخ ہوتا ہے کیا ہمارے وطن عزیز میں پتھروں کی کمی ہے ایک ایک اٹھا کر پیٹ پر باندھ لو کم پڑ جائیں گے تو باہر سے منگالیں گے۔

الفریڈ نے دشمنوں کی سرکوبی کر لی اور لاطینی کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کر لیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرے۔ اپنا خالی وقت کیسے بتائے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کے لیے منصفانہ قانون بنانے شروع کیے اس زمانے میں پارلیمنٹ وغیرہ کا ٹنٹا نہیں تھا نہ لوگ مقدمے لے کر عدالتوں میں دوڑے جاتے تھے کہ فلاں قانون غیر قانونی ہے۔ نہ بنیادی حقوق کا کھڑاک تھا۔ جب بادشاہ کو سارے حقوق حاصل ہیں تو رعایا کو فردا" فردا "حقوق لینے کی کیا ضرورت ہے الفریڈ اعظم کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا چنانچہ روایت ہے کہ لوگ سونا اچھالتے چلے جاتے تھے کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ کچھ ایمانداری کی وجہ سے ،کچھ حکومت کے خوف سے۔ بعض لوگوں نے تو سونا اچھالنا اپنا کل وقتی شغل بھی بنا لیا تھا۔ بعد میں سونے کی قلت ہوگئی تو لوگ یہ کام ٹوپیوں اور پگڑیوں سے لینے لگے۔ وہ بھی دوسروں کی ٹوپیوں اور پگڑیوں سے۔ الفریڈ نے وقت کو ناپنے کے لیے موم بتیاں ایجاد کیں لیکن ہوا چلنے سے بعض اوقات بتی جلد بجھ جاتی تھی اور وقت میں گڑبڑ ہو جاتی تھی لہذا بادشاہ نے موم بتیوں کے گرد کھڑکیاں لگا کر لالٹینیں ایجاد کی۔ سوچنے کی بات ہے کہ شاہ الفریڈ نہ ہوتا تو صدر ایوب کے زمانے میں اپوزیشن کیا کرتی۔ اسے نشستیں تو ایک طرف انتخابی نشان تک دستیاب نہ ہوتا۔ مشہور ہے کہ شاہ الفریڈ کی اپوزیشن نے بھی لالٹین کا نشان مانگا تھا لیکن شاہ نے اس کو دھتا بتایا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ شاہ الفریڈ اعظم کی تمنا تھی کہ انگلستان خوش اور خوش حال رہے۔ لیکن انسان کی ہر خواہش تھوڑا پوری ہوتی ہے۔

الفریڈ اعظم کو مذہب سے بہت شغف تھا۔ اس نے جا بجا خانقاہیں بنوائیں تاکہ لوگ وہاں جائیں اور راہب بن کر اپنی زندگی خدا کی بندگی میں بسر کریں لیکن انگریزوں کا رجحان اس زمانے میں بھی دکانداری کی طرف زیادہ اور رہبانیت کی طرف کم تھا لہذا الفریڈ کو فرانس سے راہب منگا کر ان خانقاہوں میں بسانے پڑے۔ ہمارے ہاں بھی ایمان کی حرارت والے اپنی نیک اور بعض اوقات غیر نیک کمائی سے مسجدیں تو بنا دیتے ہیں لیکن نمازیوں کا بندوبست نہیں کر پاتے چنانچہ بعض علاقوں میں ایک ایک نمازی کے حصے میں تین تین مسجدیں آجاتی ہیں۔

الفریڈ اعظم نے ایک نامعلوم مرض سے ۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ ابھی میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی ورنہ اس کے اتنے ٹسٹ ہوتے ،اتنے ایکس رے ہوتے اتنے مختلف ڈاکٹروں کے نسخوں پر اتنی جزک اور غیر جزک دوائیں اسے کھانی پڑتیں کہ دسویں صدی میں قدم رکھنے کی نوبت نہ آتی۔ نویں صدی کے آخر ہی میں علاج کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہوگیا ہوتا۔ لوگوں کا مرنا جینا نوشتہ قسمت کی بجائے نوشتہ ڈاکٹر پر منحصر ہو جانا بہت بعد کی بات ہے۔

ذکر سلطان بحر و بر کنگ کینوٹ کا

سچ مچ سمندر کی لہروں کو حکم دینے لگا

الفریڈ اعظم کا ذکر تمام ہوا۔ اب بادشاہوں کا انگلستان کی ادبی تاریخ سے براہ راست تعلق نہ رہا بلکہ یہ تو نے

لگا کہ پارلیمنٹ والے پکاتے تھے یا پکی پکائی روٹی کے پلانٹ میں لگواتے تھے اور چوگا بکنگھم پیلس بھجواتے تھے۔ یہ لوگ کچھ کھاتے تھے کچھ اپنے ٹوڈی بچوں کو کھلواتے تھے۔ ہندوستان کے بادشاہوں کے باب میں بھی روٹی کا ذکر ملتا ہے۔ خصوصاً" بیسن کی روٹی کا کہ بادشاہ کے ہاں بچ رہے یا باسی ہو جائے تو پھینکنے کی بجائے شاعر دربار کو بھیجتے تھے۔ وہ روٹی تو غالبا" نہ کھاتا تھا ثقیل ہوتی ہے۔ شوربے کے پیالے میں پھلکا بھگو کر اپنا کام چلاتا تھا لیکن طوعا" وکرہا" قصیدہ اسے ضرور لکھنا پڑتا تھا۔ وہ بادشاہ بھی گئے وہ شاعر بھی گئے۔ وہ روٹیاں تک گئیں لیکن قصیدے اب تک باقی ہیں۔

اے صاحبو حسن اتفاق سے اب جس بادشاہ کا ذکر ہم کرنے والے ہیں اس کا تعلق مدح وقصیدہ سے تھا۔ یہ شاہ کینوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے اخباری سرکاری درباری اس کی خوشامد بڑے خضوع وخشوع سے کرتے تھے۔

لیکن روٹی والے اور قصیدے والے ان دو بادشاہوں کے درمیان بھی کچھ بادشاہ آئے جن کا ذکر کتابوں میں اور تصویریں سکوں پر ملتی ہیں کچھ گول آنکھوں والے کچھ چپٹی ناک والے، کچھ داہنی طرف کو دیکھ رہے ہیں، کچھ بائیں طرف کو دیکھ رہے ہیں۔ جانے کیا دیکھ رہے ہیں، اس زمانے کے انگلستان میں کوئی چیز دیکھنے کی نہیں تو اس زمانے میں کہاں ہوگی اور سیاست میں دائیں بائیں کا رجحان ابھی نہ چلا تھا۔ اس دور کو بچگانہ بادشاہوں کا دور بھی کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تھے بھی بارہ بارہ چودہ چودہ برس کے۔ بادشاہ گروں کے ہاتھوں میں بہار جانفزاء دکھا کر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ان لوگوں سے بعض بچگانہ حرکتیں بھی ہوئیں۔ لیکن اتنی بچگانہ بھی نہیں جتنی بڑی عمر کے عاقل بالغ مدبر ولایت پاس بادشاہوں سے سرزد ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نام ایڈ سے شروع ہوتے تھے۔ مثلا" ایڈ دی ایلڈ زا ایڈ منڈ، ایڈورڈ، ایڈ دی، ایڈ گر، ایڈ شہید وغیرہ۔ اردو میں ان کے نام پڑھنے سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ امریکن ایڈ میں آئے ہوں گے۔ تبھی ان کو اتنا فروغ نہیں ہوا لیکن اتفاق سے امریکن ایڈ ابھی شروع نہ ہوئی بلکہ امریکہ بھی ابھی شروع نہ ہوا تھا اور کولمبس کے شروع ہونے میں بھی کچھ وقت تھا۔ یہ نام AID سے نہیں ED سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں سے آخری بادشاہ ایڈ منڈ اور ہمارے ممدوح شاہ کینوٹ کے درمیان کہ وطن مالوف ان کا ڈنمارک تھا اور مہاجر کہلانے کے مستحق تھے۔ پہلے تو لڑائی ہوئی پھر جنیوا کانفرنس ہوئی اور سلطنت کی تقسیم ہوئی کہ شمال میں کینوٹ رہے۔ جنوب میں ایڈ منڈ دندنائے۔ لیکن پھر دیکھتے دیکھتے لوگوں نے دیکھا کہ کینوٹ سارے ملک کا بادشاہ بن گیا۔ کیونکہ ایڈ منڈ دو ماہ کے اندر قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فوت کر دیا گیا لیکن ایسی بدگمانی بدباطن مورخین کرتے ہیں جہانگیر کے متعلق بھی لکھا کہ اس نے شیر افگن کو مروایا، نور جہاں کے راستے سے ہٹایا۔ وہ برضا و رغبت نہیں مرا۔ جہانگیر ایسا ظالم اور کینہ پرور ہوتا تو زنجیر عدل میں اتنا بڑا گھنٹہ کیوں لگواتا اور اسے اتنے زور و شور سے کیوں بجواتا کہ اس کے عہد میں سوائے انصاف اور تھوڑی سی زن مریدی کے اور کسی چیز کا ذکر ہم نہیں پاتے۔ وہ نیک بی بی نور جہاں جہاں تک ہمارا خیال ہے خود ہی کچھ کبوتر اڑانے اور کچھ کبوتر کھانے کے شوق میں ادھر چلی آئی۔ شیر افگن سپاہی زادے کے ہاں تو کئی کئی دن ہنڈیا بھی نہ پکتی ہوگی۔

شاہ کینوٹ کے رشتہ دار اچھے نہ تھے اس کی جانشینی کے باب میں برے برے خیالات دل میں لاتے ہوں گے۔ لہذا اس نے ان کو چن چن کر مروانا شروع کیا۔ منادی کرادی کہ جو شخص میرے کسی عزیز یعنی دشمن کا سر لائے گا وہ انعام پائے گا اور میرا بھائی کہلائے گا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ملک میں اخوت کا دور دورہ ہو گیا، اتنے بھائی جمع ہو گئے کہ سنبھالنے مشکل ہو گئے۔ آخر یہ رسم موقوف کرنی پڑی۔ اس اثناء میں رشتہ داروں کی معقول چھانٹی بھی ہو چکی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کے ضمیر جعفری نے اسے ملامت کی کہ تو نے ستم کیا، تو بادشاہ پادریوں کے مشورے سے روم کی زیارت پر روانہ ہو گیا اور راستے میں دریا دلی سے خیرات کرتا گیا۔ یہ خیرات کے پیسے اس نے چلنے سے پہلے انگلستان کی رعایا سے جمع کیے تھے اور بعبور دریائے شر خیرات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فارن ایکس چینج میں تھے ویسے واللہ عالم بالصواب۔

انصاف سے دیکھا جائے تو بادشاہ کینوٹ کے قصیدے بھی خواہ مخواہ ہی مشہور کر دیے گئے یہ نہ بھی ہو تو حاکم وقت کی

تعریف کرنا ہمارے نزدیک خوشامد نہیں بلکہ ایک تعمیری اندازِ فکر ہے۔ ایک طرح کی حب الوطنی اور بیدار مغزی ہے جو لوگ بادشاہ وقت کو مبارکباد دیتے ہیں، واہ واہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اس کے کارناموں پر خاص نمبر نکالتے ہیں۔ خدانخواستہ کسی لالچ یا بے اصولی کے باعث ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نیت نیک ہی ہوتی ہے۔ کم از کم اپنے بارے میں نیک ہی ہوتی ہے۔ بادشاہ کے بارے میں کوئی عیب ہو بھی تو کلام الملوک ملک الکلام کی طرح قابل عفو و درگزر ہوتا ہے۔ اس کی پچھا لیدر میں جلدی مناسب نہیں۔ اس کے تخت سے اترنے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ حق بات دیر سے یا بعد از وقت بھی کہی جائے تو آخر حق بات ہوتی ہے۔ وقت پر یعنی قبل از وقت اس کے اظہار سے چند در چند قباحتوں کا احتمال رہتا ہے جن سے بچنا چاہیے۔

پس یہ زیادتی تھی کہ جب شاہ کینوٹ کے درباریوں نے اسے باور کرایا کہ اے بادشاہ تیرا حکم خشکی پر بھی چلتا ہے اور سمندر پر بھی چلتا ہے تو وہ واقعی سمندر کنارے کرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور طوفانی لہروں کو حکم دینے لگا کہ پیچھے ہٹو۔ میں بڑے دبدبے والا بادشاہ ہوں۔ ارے کوئی ہے۔ بند کروان کو۔ ایسی باتیں تو استعارۃً کہی جاتی ہیں، اخلاقاً کہی جاتی ہیں، بادشاہ کینوٹ کو اس کے ڈانٹنے کے باوجود سمندر کی لہروں نے بھگو دیا بلکہ قریب قریب ڈبو دیا تو وہ کرسی اٹھوا کر ساحل کی طرف بھاگا اور جا کر اپنا پاجامہ بدلا، ایک آدھ روز کی بات ٹھیک ہے۔ روز روز پاجامے بھی نہیں بدلے جا سکتے، ختم ہو جاتے ہیں اور آدمی خواہ بادشاہ بھی ہو، آخر میں ننگا ہو جاتا ہے۔ پاجامے بار بار بدلنے کی بجائے بادشاہ اپنے درباری بدل دے تو زیادہ مناسب رہتا ہے لیکن بادشاہ لوگ ایسا نہیں کرتے، کم از کم ہم نے اب تک نہیں پڑھا۔

بادشاہت کی تلاش میں

فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں۔ ایک بیلٹ یعنی الیکشن کا دوسرا بلٹ یعنی گولی کا۔ ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ موثر اور کامیاب پایا گیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں، یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام زریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دواتیں خشک ہوگئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں معتدبہ کمی واقع ہوگئی ہے اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ۔ ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسر اقتدار آیا۔ عوام کی اکثریت کی رائے کوئی سند بھی نہیں لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ ووٹ دارا شکوہ کو دیتے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بڑا بدعقیدہ آدمی تھا۔ ہمارے ممدوح کے مقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے، اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا۔ اکبر اعظم تو الیکشن کا فارم بھی خود پر نہ کر سکتے تھے ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پر کرنے پڑتے۔ بادشاہ بس نشان انگشت چپ بشت کرتا۔ محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی ہم یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کھڑاگ سے گزرتے۔ امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے لیکن یہ بھی گمان ہے کہ کچھ اس قسم کا عذر کر کے کہ آج میری ٹانگ میں درد ہے۔ کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔ راتوں رات گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر لشکر کو لے کر علی علی کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے بلکہ ان کا ایک آدھ گھوڑا جاتے جاتے ہماری پھوس کی کلی کو لات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحبقراں کو۔ اصولاً تو انگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استصواب رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا اتنا ہی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مدت سے کافور ہے۔ اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو گھسے پٹے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پرامن بھی ہو۔ افسوس کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے۔ خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیوؤں کی اور اڑتے قالینوں کی داستانوں میں اس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ ملک میں انفلیشن بھی پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔ ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ کے لاولد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شادیانے بجادیتے تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ مرحوم کا کانا وزیر اس پہلے آدمی کو پہلے ہی بغلی دروازے سے یا فصیل کے برج سے رسی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اُتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرماتا وہاں دبکا پڑا رہتا تھا۔ لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں، یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے۔ خاصے گنجان حرم، بیگموں کے بھی، کنیزوں کے بھی، امراء اور وزرا کی بہو بیٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد نرینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر نیاز کے ٹوکرے وہاں تک لے جانے میں دقت ہو۔ علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کاملہ کو ظہور میں لانے کے لیے محل کے اندر حبشی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اوور ٹائم بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے، خواجہ سراؤں کی موجودگی اس میں مانع نہ ہوتی تھی۔ تاہم داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے پکی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

ہم بادشاہت کے تہہ دل سے قائل ہیں۔ اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں۔ ہم نے کئی بار لکھا کہ اب جو ہمیں خدا نے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیں بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، پیپلز پارٹی، پی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا کسی اور کو بھی بنایا جا سکتا تھا کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے تاہم ہماری شنوائی نہ ہوئی۔ انگلستان ہم اس لیے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے۔ یہاں کبھی نہ کبھی تو کوئی لاولد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں لیکن یہاں آ کر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس شہر میں نہ فصیل ہے نہ کوئی دروازہ ہے جہاں ہم کمبل لے کر پڑ جائیں اور ہر روز اخبار ٹائمز خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرے، ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ در بدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشغر کا نوجوان تاجر ملے جن کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن سیرت اور حسن صورت، لیاقت اور فطانت میں یکتائے زمانہ ہو۔ ہم نے اسی خیال سے اپنی ڈگریاں (اس ڈگری کے علاوہ جو کوآپریٹو قرضہ کی نادہندگی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کرا کے اپنے ڈرائینگ روم میں لٹکا دیں جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور بکنگھم پیلس تک پہنچ ہے اور خود عمل تسخیر شروع کر دیا۔ قباحت یہ ہوئی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت فیملی پلاننگ کا لٹریچر بھیجا تھا جس سے چند قباحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قباحت در قباحت بھی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی این کے ہاں اس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں جب اور سبھی کو ہے تو ہمیں بھی ہے۔ تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں ان کا نمبر لگ گیا۔ پانچواں ہم کہاں تک ترے پہلو سے کھسکتے جائیں۔ پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد نرینہ ہے وہ فاتر العقل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیر اعظم وقت کو ناراض کر لیں یا رومن کیتھلک، مسلمان یا کیر پینتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پہننے سے انکار کر دے کہ چبھتا ہے یا میرا ہیر ڈو اس سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بدست ہم تک آ سکتی ہے لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شہزادی نے جنم لیا ہے۔ یہ ڈچس آف گلوسٹر کی صاحبزادی ہیں اور تخت کی قطار میں بارھواں نمبر ہے۔ ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ

گلوسٹر میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوسٹر ہیں کہ نہیں تو کہنے لگے صاحب من اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ارزانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں ایک سو بارہواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے پس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ۔ اپنا وقت مت ضائع کرو۔ امیگریشن کا رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وراثت کے معاملے میں چھ کروڑ اٹھتر لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتسواں ہے۔ پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہوا کرتی تھی۔

ہم نے بتایا کہ کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں جب وقت آئے گا تو اپنے ملک سے گوارا کرنے کی کریم منگالیں گے جس کے استعمال سے حبشی تک گورے ہو سکتے ہیں اور روڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اب رہی شاہی خاندان کی بات ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جدامجد کانجر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجا تھے۔ وہ یوں کہ بظاہر راجا ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جدامجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں۔ تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے۔ تخت کے نیچے رکھتے تھے۔ ہمارے ان مہربان نے فرمایا۔ یہ انگلستان ہے۔ یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے۔ کانجر کا حوالہ نہیں چلے گا۔ ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جوہر قابل کی قدر ہوتی ہو۔ اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔ ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔ اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے بتاؤں لندن سے کون کون سی فلائٹیں سیدھی کراچی جاتی ہیں۔ ہم نے منغض ہو کر کہا۔ رہنے دو ہم خود دیکھ لیں گے۔ آدمی گڑ نہ دے گڑ کی سی بات تو کرے۔

ہم بادشاہ ہو جاتے تو کیا کرتے۔ اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچ ڈاک کے لیے دس روپے بھیج کر ہم سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری باتوں کا قلع قمع کرتے۔ پہلے قلع پھر قمع۔ جمعہ کی چھٹی کرتے لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے۔ خیر جمعے کی دو چھٹیاں کر دیں گے۔ ہمارے عہد معدالت عہد میں ہفتے میں دو جمعے ہوا کریں گے۔ تا کہ لوگ دلجمعی سے عبادت کرتے رہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی وسوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں۔ شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا، وہ بھی ہو چکی۔ لیکن ہرج نہیں۔ ہم مزید ممانعت کر دیں گے تا کہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پئیں۔ یہاں تفصیل کیا دیں۔ آزمائش شرط ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید۔

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھنی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تا کہ آنے والے مورخ غلطیاں نہ کریں۔ لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔ حب وطن ملک سلیمان خوشتر۔ اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لات مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحمدل اور بیدار مغز تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب ہیں جونہی امراء اور عمایدین کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لیے آئے گا ہم لندن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کالم کا کٹنگ سنبھال کر رکھیں۔ اپنے سب قارئین کو ہم خلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔ خصوصاً" ان کا جو نکتہ چینی کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆☆☆

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

بیمار کا حال اچھا ہے

اسپتال میں جن صاحب سے پہلے ہماری علیک سلیک ہوئی سامنے کے بستر کے بڑے میاں تھے مسٹر لوئیں۔ اسپتال میں آدمی اس طرح ایک دوسرے کا مرض پوچھتا ہے جس طرح اسپتال سے باہر خیریت دریافت کرتا ہے وہاں یہ کہ راضی باضی، بھلو چنگو، مزاج شریف۔ یہاں یہ کہ مرض مبارک کیا ہے۔ ماشاءاللہ بیماری کونسی ہے۔ اللھم زوفزد۔

روایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے۔ باتوں باتوں میں مخاطب پر واضح کیا جائے کہ تیرا مرض تو کچھ بھی نہیں۔ جانے کیسے اسپتال میں آ گیا۔ سفارشی ہوگا۔ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔ ایک صاحب کہتے ہیں مجھے دمہ ہے کھانستا ہوں تو لگتا ہے ابھی دم نکل جائے گا۔ دوسرے صاحب کہتے ہیں دمہ بھی کوئی چیز ہے مجھے دیکھو دونوں پھیپھڑے نکالے جا چکے۔ مصنوعی نالیوں سے سانس لیتا ہوں۔ اصل مرض تو گھٹیا ہے اور میرا گھٹیا تو اعلیٰ نسل کا نفرس ہے قریب قریب لاعلاج فلاں فلاں مشاہیر کا انتقال اسی میں ہوا۔ اس پر تیسرے مریض سے نہیں رہا جاتا فرماتے ہیں اماں گھٹیا بھی نامراد مرض ہے لیکن پھر ایسا بھی نہیں مجھے تو بچپن سے ہے مرضوں میں مرض ہے بھگندر۔ یہ دیکھو پورے گھٹنے پر پھیل گیا ہے۔ چوتھا مریض بڑی دیر سے بٹ بٹ دیکھ رہا تھا کہ میری باری ہی نہیں آ پاتی۔ آخر دل پر دو تھپڑ مار کر ایک طرف کو لٹک جاتا ہے کہ خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں فورا" بھگدڑ مچ جاتی ہے، اہلکار دفتر کی طرف بھاگتے ہیں کہ رجسٹر دیکھیں اس کے ذمے اسپتال کی رقم تو نہیں معقول زر ضمانت رکھوا لیا تھا نا۔ یہ ڈوب گیا تو اس کی جگہ دوسرا آ جائے گا۔ اسپتال کے پیسے نہ ڈوبنے چاہیں اگر پیسے نکلتے ہوں تو بڑے جذبے سے دل کی مالش شروع کر دیتے ہیں۔ ایک غنچہ دہن تو مصنوعی تنفس دینے کے لیے مریض کے لبوں پر لب بھی رکھ دیتی ہے وہ تھوڑی دیر مچلا پڑا رہتا ہے ، پھر کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے وہ کونسا مر گیا تھا اور اس قسم کے تو علاج سے سنا ہے۔ سچ مچ کے تن مردہ میں بھی جان پڑ جاتی ہے ہمارے بعض دوست جو اسپتال میں رہے ہیں، رات میں کئی کئی بار مصنوعی تنفس لیا کرتے تھے بلکہ ایسے ماہر ہوئے کہ خود نرسوں کو دیا کرتے تھے بتاتے ہیں اس سے بڑا افائدہ ہوتا ہے اب تک ہونٹ چاٹتے ہیں (اب اپنے) کوئی کام کا مسیحا نظر آیا تو ہم بھی یہ علاج آزما کے دیکھیں گے۔

القصہ مسٹر لوئیس نے ہم سے پوچھا ،" کیوں آئے۔ کس مرض میں آئے۔"

ہم نے کہا۔ "پہلے آپ"

بولے" سمجھ میں نہیں آتا کیا مرض ہے۔ مجھے ایک ایک کے دو دو نظر آتے ہیں۔ مثلاً تمہارے میز پر ایک گلاس رکھا ہے۔ مجھے دو نظر آ رہے ہیں"

ہم نے کہا" لوئیس صاحب دو ہی تو ہیں یہ رہا ایک یہ رہا دوسرا۔ یہ اسپتال کا ہے یہ میں گھر سے لایا ہوں"

بولے" تمہارے پلنگ کے پاس اسٹول بھی دو دکھائی دے رہے ہیں حالانکہ ایک ہے۔ ہر پلنگ کے ساتھ ایک ہوتا ہے"

ہم نے کہا" اسٹول بھی دو ہی ہیں ایک یہ ساتھ والے مریض کا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ادھر رکھ گیا"

اب فرمانے لگے" مجھے تو تم بھی دو ہی نظر آتے ہو"

اب ہم چپ ہو گئے ان سے کیا کہتے کہ ہم بھی دو ہی ہیں۔ تمہیں غلط نظر نہیں آ رہا۔ بلکہ حقیقت پوچھو تو دو سے زیادہ ہیں۔

ہم جب دیکھیں بہروپ نیا

ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو

اب انہوں نے ہمارا پوچھا ، ہم نے کہا ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑا سا غم جاناں ہے یہ مرض ایشیا میں ، خاص کر ہمارے ملک میں زیادہ ہوتا ہے اور وبائی ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس کی علامت بھی نثر میں بتانے میں لطف نہیں اور شاعری کا ترجمہ ہم سے نہیں ہوتا۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ سرجن غازی GAZET نے ہمارے پیٹ میں لمبا سا شگاف دے کر پہلے ہماری تلی نکال کر ایک طرف کو پھینک دی کہ

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی

پھر اپنڈکس نکال کر یہ نام ہی سے شے زائد ہے۔ سامنے چند غدود تھے، ان کو بھی نکال کر تھال میں سجا دیا مختار صدیقی نے لکھا۔ گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود۔ ہم کسی طرف سے گورے نہیں اس لیے ہمارے غدودوں کے نعم البدل کی بھی ضرورت نہ سمجھی گئی یا یہ سوچا ہو گا کہ ان صاحب نے جوانی میں اپنے غدودوں سے کونسا تعمیری کام لیا، کون سا تیر مارا جو بندر کے غدودوں سے ماریں گے۔ ایک طرف جگر لٹکا نظر آیا خیریت ہوئی کہ اسے نہیں نکالا۔ لیکن اس کا ایک ٹکڑا یعنی جگر گوشہ نکال کر نمونہ کلام کے طور پر رکھ لیا۔ پھر کچھ اور نکالنے کے سوچ رہے تھے۔ دوسرے ڈاکٹر کو رحم آ گیا۔ اس نے کہا بچارے کے پیٹ میں کچھ تو رہنے دو بالکل ہی پیٹھ سے نہ لگ جائے۔ یہاں آپ کو جوش صاحب کا قصہ یاد آئے گا "یادوں کی برات" والا کہ "ارے کچھ تو پیٹ میں جائے" لیکن وہ اور مضمون ہے۔ بڑے آدمیوں کی بھوک بھی بڑی۔ ہمارے پیٹ میں کئی خرابیاں ہیں ایک تو اس میں کوئی بات نہیں پچتی ، گولیاں کھائیں ، مکسچر پئے۔ لکڑ ہضم ، پتھر ہضم ، چورن نوش جاں کیے کچھ فائدہ نہ ہوا خیر پیٹ کا ذکر ضمنی ہے نام اس مرض کا انگریز ڈاکٹر ہاجکن HODGKINS کے نام پر ہے اور اس کا تعلق جسم کی گلٹیوں سے ہے اس نے اسے ۱۸۳۲ء میں دریافت کیا۔ مرض تو دریافت کر لیا لیکن اس کا علاج تو ایک طرف، وجہ مرض تک دریافت نہ کی چنانچہ یہ اب تک دریافت نہ ہو سکی ہم پہلے تو خوش ہوئے کہ دیکھو ایک مشہور انگریز کے نام کا مرض ہمیں لگا۔ جو بہت نادر و نایاب بھی ہے۔ کھانسی ، نمونیہ ، تپ دق ، ٹائیفائیڈ ، ملیریا کی طرح عامیانہ نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں پڑھا تو پریشانی ہوئی کہ ٹیڑھا مرض ہے جان لیوا ہے یعنی اس کا علاج یقینی نہیں ہے جو ہے وہ تجرباتی ہے۔ ان انگریزوں ، امریکنوں ، جرمنوں کو نئے نئے مرض دریافت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں پھر ایک ایک مرض کے لیے دس دس دوائیں کھلواتے ہیں کہ کوئی تو کارگر ہوگی۔ اپریشن وغیرہ اس کے علاوہ۔ یہ نہیں کہ ایک امرت دھارا ایجاد کر لیا اسی کو کھایا۔ اسی کو لگایا اس کو پانی میں ڈال کر پی گئے اسی کو رومال میں ڈال کر سونگھ لیا ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں نے ایسے سفوف بنا رکھے ہیں کہ قبض والے کو بھی وہی ، اسہال والے کو بھی وہی۔ کان دکھتا ہو ، پھنسی نکلی ہو ، پیشاب نہ آتا ہو ، پیشاب بہت آتا ہو ، سر کے بال جھڑتے ہوں تو نہار منہ کھائیے۔ ورنہ پانی میں گھول کر بطور بال صفا پوڈر کے لگائیے۔ ایک صاحب تو اپنی دوا کا اشتہار دیتے ہیں کہ بواسیر اور دیگر امراض چشم کے لیے اکسیر ہے۔ یعنی سرمے ہمارے حکما نے ایجاد کر رکھے ہیں کہ بصارت کے علاوہ بصیرت بھی عطا کرتے ہیں انسان کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں آج کل ریسرچ کے مارے امراض کی ریل پیل کا یہ عالم ہے کہ مریض کی سمجھ میں نہیں آتا کس مرض سے مرے۔ پرانے زمانے میں شرفا چپ چاپ قضائے الٰہی سے انتقال کر جاتے تھے اب قضائے الٰہی نام کا مرض کسی کتاب میں نہ ملے گا ڈاکٹروں کا اللہ تعالیٰ سے ایمان بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔

جانے کب غالباً" رات کو ہوش آیا تو دیکھا ، سر پر طرہ ہار گلے میں یعنی ناک میں نالی ہے بازوں میں سوئی ، سرہانے گلوکوز کی بوتل یعنی پلاسٹک کی تھیلی۔ ایک اور نالی پیٹ میں پیوست تا کہ آپریشن سے رستا ہوا خون اندر نہ رہ جائے۔ ہاں پیٹ کو ہم بھول ہی گئے کہ اس پر ٹانکے اور ٹانکوں پر پھاہے اور پھاہوں پر پٹی۔ ابھی سر کی ... تھی ... گی۔ ہم نے دوستوں کو کہلوا دیا تھا کہ اس

عالم میں ہمیں کوئی دیکھنے نہ آئے ایک دو روز بعد ہی۔ لیکن اگلے روز ناک کی نالی نکلوا کر ہی بیٹھے تھے کہ فیض صاحب جولندن آئے ہوئے تھے تشریف لے آئے۔ فیض صاحب کسی کو دیکھنے آئیں تو اسے اسی وجہ سے آپریشن کرا لینا چاہیے گویا یہ ہمیں مفت پڑا ان کے ساتھ حمید اختر بھی ابن حسن برنی اور پھر تو دوستوں کا تانتا بندھ گیا۔ جنگل میں منگل ہو گیا ہمارا آپریشن بھی تو منگل کے روز ہوا تھا۔

چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشک باغ فصل بہار تھی کہ ہم آئے اسیر ہو۔ آپریشن آج کل معمولی چیز ہے۔ نہ بھی ضرورت ہو تو ڈاکٹر شوقیہ کر دیتے ہیں ایک صاحب کو کھانسی تھی وہ مکسچر لینے گئے۔ ڈاکٹر نے ان کی پنڈلی کا آپریشن کر کے پٹی باندھ دی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بعد ان کی پنڈلی میں مستقل درد رہنے لگا لیکن کھانسی ختم ہو گئی۔ مریض کا معاملہ البتہ الگ ہے آپریشن سے زیادہ اس کی جان آپریشن کے خیال سے جاتی ہے ہمارا آپریشن خاصا بڑا تھا ہم نے پاکستان اپنے گھر والوں کو اطلاع بھی نہ دی یہیں دوستوں سے کہہ دیا کہ بھئی کچھ ہو گیا تو صورت حال کو سنبھالنا -بعد میں لوگوں نے ہمیں داد دی کہ بڑے بہادر آدمی ہو چپ چاپ اتنا بڑا آپریشن کرا لیا اس پر ہمیں ان صاحب کا لطیفہ یاد آیا جو جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے ایک مسافر کا پاؤں رپٹا یا کچھ اور ہوا اور وہ پانی میں جا گرا غوطے کھانے لگا۔ سبھی لوگ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئے صاحب مذکور کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے کود گئے اور اسے بچا لائے۔ ان کو بھی لوگوں نے داد دی تو وہ فریاد کرنے لگا کہ پہلے یہ بتاؤ مجھے دھکا کس نابکار نے دیا تھا۔

ہمارے آپریشن کے لیے پہلے یکم اپریل کی تاریخ دی گئی تھی اس روز آپریشن کرانا ہمیں حماقت نظر آیا۔ دوسرے بھی یہی خیال کرتے اس سے قطع نظر ہمت بھی نہ پڑی جھرجھری سی آئی کچھ بہانہ بنا کر مہلت لے لی۔ اگلی تاریخ ۱۹ اپریل دی گئی اور ہم ۱۷ اپریل کو داخل ہو گئے۔ اٹھارہ کو ہمارے حکیم سعید دہلوی دیکھنے کو آئے ہم نے کہا ابھی وقت ہے حکیم صاحب کوئی طب مشرق ،کوئی جوشاندہ ،کوئی کشتہ ،معجون مرکب کہ نشتر سے جان بچے۔ فرمایا 'چڑھ جا بچہ سولی رام بھلی کرے گا۔ اس کا علاج یہی ہے جو کر رہے ہو۔ پھر بھی رات کو جی چاہا کہ بھاگ چلو ہم نے فضل بک ڈپو کے جاسوسی ناول پڑھ رکھے تھے دو چادروں کو گرہ لگائی، ان کے ساتھ ایک تولئے کو جوڑا پھر کھڑکی سے جھانکا افسوس کہ ہم تیسری منزل پر تھے۔ آپریشن میں جان جانے کا اتنا امکان نہ تھا جتنا اس فرار کے طریقے میں پھر اور بھی کئی مصلحتیں آڑے آئیں، ہم نے تاریخ اسلام سے متقدمین کے شجاعانہ کارنامے یاد کر کے دل کو بڑھایا۔ سلطان ٹیپو کا قول بھی یاد آیا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے پھر غور کیا تو یہ کچھ اپنے احوال کے مطابق نہیں بلکہ کچھ خلاف ہی جاتا نظر آیا۔ کھانا پینا رات ہی سے بند کر دیا گیا صبح دم غسل کے بعد خاص آپریشن کا لباس پہنا دیا گیا اب آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پابجولاں چلے دست افشاں چلے۔ آ گئے آپریشن تھیٹر کے دروازے پر۔ پھر ایک ڈاکٹر نے ہمیں انجیکشن دیا اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بیہوش ہونے سے پہلے ہم نے اس ڈاکٹر کی صورت کو مانوس پا کر پوچھا ''آپ کہاں کے ہیں۔'' بولے'' بنگلہ دیش کا ہوں، نام ڈاکٹر احمد !'' ہم نے کہا'' الحمدللہ، اگر یہ آخری نظر ہے تو اپنے ایک بھائی پر ہی پڑی ہے''

گلوکوز کی بوتل کا سٹینڈ چلیپا کی شکل کا ہے اور اس کے نیچے پہیے لگے ہیں ہم اسے لے کر کاریڈور میں ٹہلنے کو نکلتے ہیں۔ تو لگتا ہے حضرت عیسٰی کا کوئی حواری یا نام لیوا صلیب لے کر نکلا ہو۔ انسان اپنی چھوٹی سی تکلیف کو کتنی بڑی سمجھنے لگتا ہے بیشک ہمارے پیٹ میں بھی آپریشن کے زخم کا احساس یوں ہوتا تھا جیسے کیل گاڑی گئی ہو لیکن وہاں کیل گاڑنے کا مقصد ہلاک کرنا تھا۔ یہاں جان بچانا یہاں ہر قسم کی احتیاط اور مرہم پٹی کہ زخم بگڑ نہ جائے۔ وہاں اس کے برعکس۔ یہاں دم دلاسا ہمدردی مزاج پرسی وہاں طعن و تشنیع وہاں سنگ و خشت یہاں پھولوں کے گلدستے۔ وہاں چوبیں کنکری ،یہاں نرم و گرم بستر ،چائے پانی ،دوا دارو۔ یہ سچ ہے کہ ان مصلوبوں اور شہیدوں کو جو شہرت نصیب ہوئی ہمارے حصے میں نہ آئی۔ آج دنیا میں کروڑوں لوگ ان کے نام لیوا ہیں۔ ان پر کتابیں چھپتی ہیں۔ فلمیں بنتی ہیں درود و سلام بھیجتے ہیں لیکن ہم اسی شہرت سے درگزرے۔ ہم یہ سب کچھ نہیں چاہتے ہم تو جینا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اپنی دنیاداری کے متعلقات کے ساتھ۔

؎ حق اچھا پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا

تم بھی کوئی منصور اہو جو سولی پر چڑھو خاموش رہو

بستر کی پائنتی پر کئی بٹن ہیں جو کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے اکثر نتیجہ خلاف منشا نکلا۔ کئی بار بلا ارادہ ہاتھ کسی بٹن پر پڑ گیا تو مشین چلنی شروع ہو گئی اور سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوتیں چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے ہمارے ملک کے ہسپتالوں میں ہتھیلی گھما کر اوپر نیچے کرتے ہیں وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اونچا کرنا ہو ادھر پایوں کے نیچے اینٹیں رکھ دی جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اینٹیں وقت کے وقت نہیں ملتیں ،تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا۔

یہاں ہر کپڑے پر اسپتال کا نام اور سن درج ہے یعنی جس سن عیسوی میں وہ چیز خریدی گئی ہمارا دھاریدار گاؤن جسے پہن کر کبھی کبھی ہم شاہانہ کروفر سے نکلتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے مریضوں کی بے لوث خدمت کر رہا ہے یہاں اوسطا" مریض دو ہفتے ٹھہرتا ہے۔ کوئی کم زیادہ بھی لیکن حساب کے لیے دو ہفتے ہی رکھیے اس لحاظ سے کتنے مریض اب تک اس گاؤن کے حصے میں آئے۔ کوئی چار سو یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے - کہیں کہیں سے مسک گیا ہے۔ مریض تو اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ لانڈری میں ایسا ہوا ہوگا۔ ابھی دو چار سال بخوبی کام دے سکے گا۔ اس کا پٹکا نہیں ہے اس کی جگہ ہم اپنا ازار بند ڈال لیتے ہیں۔ ازار بند کے ذکر سے نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب کا ایک بند یاد آتا ہے بعض پیشوں کے کساد بازاری کے مضمون میں دو دو مہینے، پورا نقل نہیں کر سکتے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے تطہیر نہ ہو جائے عاقبت تو ہماری مشتبہ ہے ہی دنیا بھی خراب کر بیٹھیں۔

ہم سفر حضر میں اپنے ساتھ کتابیں ضرور رکھتے ہیں اور ان میں اپنی بھی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے محبوب مصنف ہیں۔ اپنی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو ہم نے نہ پڑھی ہوگی۔ کیا انداز تحریر ہے! کئی بار تو اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے حالانکہ قاعدے سے یہ کام کوئی اور کرتا اور صیغہ تانیث میں کرتا تو اور بہتر ہوتا۔

اس بار ہمارے ساتھ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' ہے اس میں ایک گروپ فوٹو ہے جس میں کچھ لوگ مارسل چن زی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کے بالکل ساتھ ایک طرف پرنسپل ابراہیم خاں ہیں دوسری طرف ایک ہٹا کٹا کلے بھرے ہوئے قد میں دوسروں سے کچھ نکلتا ہوا ہم نے غور سے دیکھا یہ ہم خود تھے ہمیں یقین نہ آیا لیکن نیچے نام بھی لکھا ہوا تھا اس وقت اس جسم پر پچیس پونڈ زیادہ گوشت تھا۔ مٹن کے حساب سے بھی دام لگایئے یا کسی قصائی سے لگوایئے تو کتنے کا نقصان اب تک ہو چکا......!

آج کل ہمیں ایسے ایسے مرتب اور عالمانہ خواب آتے ہیں کہ بعض اوقات شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم اپنے علم کو اتنا سطحی اور دماغ کو اتنا پراگندہ کیوں سمجھتے رہے ہماری حد تک اس کا باعث کسر نفسی یعنی طبعی انکسار اور حلم بھی ہو سکتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اوروں کو بھی ہمارے بارے میں ایسے ہی مغالطے میں مبتلا پایا۔ اپنے جوہر قابل کی اس ناقدری پر دلی افسوس ہوا بعض خواب تو اتنے بلیغ اور فاضلانہ تھے کہ خود ہماری سمجھ میں نہ آئے اب یاد بھی نہیں کہ بطور ثبوت یہاں درج کریں۔

احباب آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی پھل ضرور لے آتے ہیں ہم کچھ کھاتے ہیں کچھ نرسوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ راقم مصنف کا شعر ہے

؎ جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال

شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

(ابن انشا نے یہ کالم اپنے آخری دنوں میں لندن میں تحریر کیا جہاں وہ ایک ہسپتال میں بغرض علاج داخل تھے۔ یہ ان کی آخری تحریروں میں سے ایک ہے۔ادارہ)

نظر ثانی کے بعد

ایک مضمون نگار ایڈیٹر "قومی ادب" کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھکتے۔

"جی' معاف فرمایئے گا مجھے علامہ استاد جگت پوری سے ملنا ہے جو "قومی ادب" کے ایڈیٹر ہیں۔

ایڈیٹر: آیئے تشریف لایئے۔اسم شریف

مضمون نگار: جی میرا نام الہ دین ہے۔ چراغ تخلص کرتا ہوں۔شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ادب گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے نکڑ دادا کے نکڑ دادا شیر شاہ سوری کے زمانے میں اصفہان جنت نشان سے آئے تھے۔میرے والد کی خالہ کے پھوپھا سر شاداں ناشاد پوری بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔

ایڈیٹر: آپ کیا لکھتے ہیں؟

مضمون نگار: جی ایک افسانہ لایا ہوں۔بالکل اچھوتا موضوع ہے آپ دیکھیں گے تو۔۔۔۔

ایڈیٹر: خوب چھوڑ جایئے افسانہ۔اس کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ ضرور ہونا چاہئے۔ آپ کو چھ مہینے کے اندر اندر اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔

مضمون نگار: (لجاجت سے) جی اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ چھوٹا سا تو افسانہ ہے۔ آپ ابھی سن لیں اور اپنی رائے مجھے بتا دیں۔ بس تین چار منٹ کی بات ہے۔ آپ اجازت دیں تو۔۔۔۔

ایڈیٹر: (گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا، خیر، پڑھئے کیا عنوان ہے۔

مضمون نگار: جی عنوان بھی اچھوتا رکھا ہے میں نے۔ "کار خیر" اس کا عنوان "بہادر اللہ دِتہ" بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ پرانے فیشن کا ہے۔

ایڈیٹر: اچھا اچھا پڑھئے۔

مضمون نگار: (پڑھتا ہے)

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی، یکایک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "آگ، آگ، بچاؤ، بچاؤ" معلوم ہوتا تھا کوئی لاپروا کرایے دار انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ اب وہ شخص آگے آگے تھا اور آگ پیچھے پیچھے۔دفعتاً آگ بجھانے والے انجن کا گھگھو سنائی دیا۔ فائر مین اللہ دتہ جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا۔ دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر دراتا ہوا کمرے میں گھس گیا اور اس حواس باختہ شخص کو شعلوں میں سے نکال لایا۔ اب اس نے شست باندھ کر پانی کا تریڑا دیا اور آگ بجھ گئی۔ آگ بجھانے کے دستے کا جمعدار پیر اولاد بخش آگے بڑھا اور بولا۔ "آفرین ہے تیری بہادری پر، محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی"۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا "ذرا دیکھنا تمہاری داہنی مونچھ جل رہی ہے"۔ بہادر اللہ دتہ بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی داہنی

مونچھ پر بھی دیا۔ دور مشرق میں سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا''۔

ایڈیٹر: افسانہ برا نہیں۔ عنوان کیا بتایا تھا؟ ''کار خیر'' یہ بھی اس پر عین چسپاں ہوتا ہے تاہم بعض جگہ نظر ثانی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسی اچھی کہانی میں کوئی عیب رہ جائے، یہ افسوس کی بات ہوگی۔ ذرا شروع سے پڑھیے، دیکھیں اس کا کیا ہو سکتا ہے۔

مضمون نگار: سنیے۔

''رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا''

ایڈیٹر: (سر ہلاتے ہوئے) یہ تو نہیں چلے گا۔ ہر کوئی کا مطلب ہے پولیس والے بھی سو رہے تھے یعنی اپنی ڈیوٹی سے غافل تھے۔ نا نا یہ ٹھیک نہیں لوگ سمجھیں گے اس ملک میں چوکی پہرے کا انتظام ٹھیک نہیں۔۔۔۔اسے بدل کر یوں کر دیجئے۔

''رات کے تین بجے ہوں گے کوئی آدمی خواب خرگوش کے مزے نہیں لوٹ رہا تھا''۔

مضمون نگار: (نیم احتجاجی لہجے میں) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات کا منظر ہے۔ ایسے میں لوگ تو سو ہی رہے ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر: ہاں آپ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اچھا تو یونہی سہی۔

''شہر میں ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا لیکن ہوشیار اور چوکس تھا''۔

مضمون نگار: (منمناتے ہوئے) جی کیا فرمایا؟ سو رہا تھا اور چوکس بھی تھا؟

ایڈیٹر: ہاں یہ بھی کچھ بے معنی سی بات ہوگئی۔ اچھا یوں تو کر سکتے ہیں ''کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کچھ ہوشیار اور چوکس تھے''۔۔۔۔۔چلیے، آگے چلیے۔

مضمون نگار: (کھنکھارتے ہوئے)''کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی''۔

ایڈیٹر: رکیئے۔ کیا مطلب آپ کا، کیا ہمارے ملک میں ایسے بلب بنتے ہیں کہ جل کے روشنی نہیں دیتے۔

مضمون نگار: جی نہیں۔ یہ بات نہیں رات میں بلب بجھا دیئے جاتے ہیں۔

ایڈیٹر: عزیز من۔ سب لوگ اتنے سمجھدار نہیں ہوتے کہ یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ بہت سے تو یہ سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں بلب ناقص بنتے ہیں۔ میری مانو تو اسے کاٹ ہی دو اگر بلب جل نہیں رہے تھے تو ان کے ذکر سے فائدہ؟

مضمون نگار: (کسمساتے ہوئے آگے بڑھتا ہے)

یکا یک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

''آگ، آگ، بچاؤ، بچاؤ''

ایڈیٹر: گویا بھگدڑ مچ گئی۔

مضمون نگار: جی ہاں۔

ایڈیٹر: گویا ہم اپنے پرچے میں اس بات کو شہرت دیں کہ ہمارے عوام میں ذرا سی بات پر بھگدڑ مچ جاتی ہے یعنی وہ اوسان کھو بیٹھتے ہیں۔۔۔۔نہ صاحب یہ نہیں چلے گا۔ یہ ''قومی ادب'' کا دفتر ہے ''سرخ آفتاب'' کا نہیں۔

مضمون نگار: جی یہ تو محض افسانہ ہے۔ ایک تخلیقی کوشش، میں بس آگ کا منظر بیان کر رہا تھا۔

ایڈیٹر: آپ اس میں ایک مطمئن مزاج اور اپنے فرائض سے باخبر شہری کی بجائے ایک ایسا کردار لاتے ہیں جس کے محض ذرا سی بات پر، محض مکان کو آگ لگ جانے سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ آپ کی جگہ ہوتا تو بچاؤ بچاؤ کی بجائے اس کردار سے کوئی ایسی بات

کہلواتا جو قومی تقاضوں کے زیادہ مطابق ہوتی۔

مضمون نگار: مثلاً!

ایڈیٹر: مثلاً وہ کہہ سکتا تھا۔

''اجی ایسی آگیں بہت دیکھی ہوئی ہیں۔ ابھی بجھا دیں گے''

بلکہ اس کو کہنا چاہیے۔

''آگ واگ کچھ بھی نہیں۔ تخریب پسندوں کا پروپیگنڈہ ہے''

مضمون نگار: (مری ہوئی آواز میں) جی آگ تو بہرحال لگی تھی۔

ایڈیٹر: ہم جب کہتے ہیں آگ واگ کچھ بھی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہے بھی تو ہم کیا پروا کرتے ہیں۔ دلاوروں کے آگے آگ کیا ہستی ہے۔ بقول شاعر

؎ اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پر آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

مضمون نگار: خیر آپ کے کرنے سے کر لیتا ہوں لیکن اس سے بات نہیں بنتی۔

ایڈیٹر: بنتی کیوں نہیں۔ آپ آگے چلیئے۔ آخر اس شخص کو اس بری طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے۔

مضمون نگار: (آگے پڑھتے ہوئے)

معلوم ہوتا تھا کوئی لاپروا کرائے دار انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔

ایڈیٹر: کیا کرایہ دار؟

مضمون نگار: لاپروا۔

ایڈیٹر: اول تو لاپروا کی ترکیب ہی غلط ہے لا عربی کا پروا فارسی کا۔ یا شاید ہندی کا۔ خیر اسے بھی جانے دیجئے آج کل سبھی غلط زبان لکھتے ہیں لیکن لاپرواہی اور غفلت کی ہم اپنے پرچے کے صفحات میں تشہیر کریں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ شخص مذکور انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ آپ ہمارے پڑھنے والوں کے سامنے ایک غلط مثال پیش کر رہے ہیں تا کہ وہ بھی ایسی ہی غفلت کریں۔

مضمون نگار: (معذرتاً) خدا گواہ ہے میں نے اس نیت سے نہیں لکھا۔ انگیٹھی کا ذکر اس لئے کیا کہ اس کے بغیر آگ نہ لگتی۔

ایڈیٹر: چلیئے مان لیا۔ آگ نہ لگتی۔ اس سے کیا نقصان ہوتا؟

مضمون نگار: نقصان کچھ نہ ہوتا بلکہ نہ لگتی تو اچھا تھا۔

ایڈیٹر: اب آئے نہ راہ پر۔ تو پھر یونہی لکھو بھی۔ انگیٹھی کا ذکر بالکل اڑا دو۔ آگ کے ذکر کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اچھا اب آگے پڑھو۔ بیچ کا حصہ چھوڑ کر سیدھے سیدھے فائر مین کے کردار پر آ جاؤ۔

مضمون نگار: ''فائر مین اللہ دتہ جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا''

ایڈیٹر: خوب بہت خوب لکھا ہے آپ نے، ہمارا وطن بھی جہلم کے ضلع میں ہے۔ وہاں کے لوگ ہوتے ہی بہادر ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں پندرھویں پنجاب رجمنٹ۔۔۔۔۔۔

مضمون نگار: (بات کاٹ کر پڑھنا جاری رکھتے ہوئے)

''دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا''۔

ایڈیٹر: میں! سوچتا رہا؟ نہیں نہیں۔ فائرمین کو سوچتے مت دکھایئے۔ اس کا کام تو بس آگ بجھانا ہے۔

مضمون نگار: اس سے کہانی میں زور پیدا ہوتا ہے۔

ایڈیٹر: کہانی میں زور پیدا ہو گیا تو کیا۔ اس سے فائرمین کی تو کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا تو فائرمین کے ذکر کی کیا حاجت ہے۔

مضمون نگار: لیکن پھر فائرمین اللہ دتہ اور جمعدار اولا دبخش کے مکالمے کا موقع کیسے پیدا ہو گا؟

ایڈیٹر: یہ مکالمے تو آپ ان کے دفتر میں بھی دکھا سکتے ہیں۔

مضمون نگار: (پڑھتا ہے) ''آگ بجھانے کے دستے کا جمعدار پیر اولا دبخش، آگے بڑھا اور بولا۔

''آفرین ہے تیری بہادری پر، محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی''۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا

''ذرا دیکھنا تمہاری داہنی مونچھ جل رہی ہے''۔ بہادر اللہ دتہ بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی داہنی مونچھ پر بھی دیا۔ دور مشرق میں سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا''۔

ایڈیٹر: کیا یہ ذکر بہت ضروری ہے؟

مضمون نگار: کس چیز کا ذکر؟

ایڈیٹر: جلتی ہوئی مونچھ کا ذکر۔

مضمون نگار: یہ تو میں نے اپنے افسانے میں مزاح پیدا کرنے کے لئے ڈالا ہے۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس شخص کا ایسا انہماک دکھایا گیا ہے کہ اسے اپنی مونچھ کے جلنے تک کی خبر نہیں۔

ایڈیٹر: میری مانیئے تو آپ اس ذکر کو خارج ہی رکھئے۔ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا۔ جب مکان کو آگ نہیں لگی تو مونچھ کو لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

مضمون نگار: (پہلو بدل کر) مزاح کا عنصر!

ایڈیٹر: وہ تو ویسے بھی رہے گا۔ لوگ کب ہنستے ہیں؟ جب ان کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ کیا آگ کا ذکر نکال دینے سے پریشانی رفع نہیں ہو جاتی؟ ضرور ہو جاتی ہے لہٰذا ہر شخص خوش ہو گا۔ ہر شخص خود بخود ہنسے گا۔ اچھا اب شروع سے سنا دو کہ کہانی کی کیا صورت ہے۔

مضمون نگار: جی سنیئے۔

''رات کے تین بجے ہوں گے کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، کچھ ہوشیار کچھ چوکس تھے۔ یکا یک ایک مکان کی چوتھی منزل سے کوئی پکارا۔ ''آگ واگ کچھ بھی نہیں لگی۔ تخریب پسندوں کا پروپیگنڈا ہے''۔ فائرمین اللہ دتہ منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا۔ آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار پیر اولا دبخش آگے بڑھ کر اس سے بولا۔ آفرین ہے تیری بہادری پر، محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔ اللہ دتہ مسکرایا اور پانی کا تریڑا اپنی داہنی مونچھ پر دیا۔ دور افق پر سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا''۔

ایڈیٹر: اب بات بنی نا؟ اب افسانہ بے نقص ہے اور ماہنامہ ''قومی ادب'' اسے آب و تاب سے چھاپے گا۔ نہیں شکریئے کی ضرورت نہیں ''قومی ادب'' ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

جرمنی

(۱۲، اکتوبر تا ۲۶، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

''مارک ٹوین نے اپنے ایک ناول کے دیباچے میں لکھا تھا: ''اگر کوئی شخص اس کہانی میں مقصد تلاش کرتا ہوا پایا گیا تو اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اس کتاب سے سبق لینے کی کوشش کی تو اُسے ملک بدر کر دیا جائے گا اور اگر کسی نے اس میں پلاٹ تلاش کرنے کی جرأت کی تو اُسے گولی ماردی جائے گی۔'' ہم طبیعت کے ایسے متشدد نہیں ہیں جیسے مارک ٹوین تھے۔ تاہم اتنا خبردار کریں گے کہ اگر کسی نے اس سفرنامے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس سفرنامے کو گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی کوشش کرے گا، نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اصل میں یہ اس قسم کا سفرنامہ نہیں، جو سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک آوارہ گرد کی آوارہ ڈائری کے منتشر اوراق ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطے کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہم پر، اور ان ملکوں پر ہمارے ہاتھوں گزرتی رہی بے کم و کاست رقم کر دیا کرتے تھے۔ بارہ ولایتوں اور ستائیس شہروں کا یہ سفر بہت سے اور سفروں اور آوارگیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ (ابن انشا) ''

اب ہم فرینکفرٹ میں ہیں

انگریزوں کو دعویٰ تو انگریزی دانی کا ہے لیکن ڈھنگ سے بولنی نہیں آتی۔ ہمارے پلے بس ان کی آدھی بات پڑتی ہے۔ کبھی وہ بھی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قسمت ہی تھی جو ہمیں لفتانزا کا جہاز مل گیا۔ ہم لدے پھندے لندن ایئرپورٹ کی عمارت پر انتظار کرتے رہے کہ اب ہانک پڑتی ہے۔ اس دوران مائیکروفون پر کچھ گنگناہٹ ضرور ہوئی لیکن ایسی کہ ہم نے اسے قابل اعتماد نہ جانا۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو ڈیسک پر جا کر پوچھا کہ ''بی بی جی! یہ جرمن ایئرلائن لفتانزا کا جہاز نمبر ۲۲۳ جاتا کب ہے۔''

''کون سا جہاز؟'' بی بی نے پوچھا

''فرینکفرٹ والا''

بولیں۔ ''وہ تو چلا گیا۔ آپ کہاں تھے؟''

ہم نے بتایا کہ ''کافی پی رہے تھے۔''

اب وہ بچاری بھاگیں۔ بولیں۔ قاعدے سے تو چلے جانا چاہیئے لیکن شاید۔ ایک برآمدے سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، مسافروں پر گرتے پڑتے۔ ایکسوزمی ایکسوزمی کہتے کہتے ایک جگہ پہنچے جہاں مسافروں کو کوچ لیکر ہوائی جہاز تک جاتا کیونکہ آخر لندن کا ٹریفک ہے جہاز اس عمارت سے کوئی پون میل دور اترتا ہے۔ اُن لوگوں نے بھی کہا۔ آپ کی قسمت۔ کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور ہری لال روشنیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے سرپٹ بھاگا۔ ہمارے وہاں پہنچتے تک سیڑھی اٹھالی گئی تھی لیکن ہم نے کہا۔ ''ارے ظالموں، جرمنو، کیا کرتے ہو۔ پھر لگاؤ سیڑھی۔ آخر ہم ... ہمارا انتظار کرتے ہی بنی۔ ورنہ ہمارا سامان جو پہلے

ہی بار ہو چکا تھا۔ فرینکفرٹ چلا گیا ہوتا اور ہم خالی لندن میں ٹاپتے رہ جاتے۔

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

ہوٹل زیپلن، سبحان اللہ کیا عمدہ ہوٹل ہے، یہ پہلا ہوٹل ہے جس کا غسل خانہ چھوٹا ہونے کی ہم شکایت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہی نہیں۔ ہم نے آتے ہی منیجر صاحب سے کہا

''یہ کیا غیر معقولیت ہے۔ آپ ہمیں کمرہ دیں یا نہ دیں۔ ہمیں غسل خانہ ضرور چاہیئے۔ ہم نہانے دھونے والے آدمی ہیں''

بولا ''جناب یہ بھی غنیمت جانئے کہ آپ کا پیغام ڈیڑھ مہینے پہلے مل گیا تھا اس لیے کمرہ آپ کے لیے ہم نے ریزرو کر دیا ورنہ فرینکفرٹ کتاب میلے کا رش ایسا ہے کہ کسی ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آپ کے فلور پر ایک مشترکہ غسل خانہ ضرور ہے لیکن وہ ایک امریکن جوڑے نے ریزرو کر رکھا ہے۔ وہ دو دن بعد چلا جائے گا تو شوق سے دن بھر ٹب میں بیٹھ کر اشنان فرمایئے گا۔''

''ٹائلٹ تو ہے نا؟ یعنی آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں۔''

''جی ہاں وہ ہے اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے آپ کے کمرے میں وہ چیز بھی ہے آپ سمجھتے ہیں نا؟''

''جی ہاں۔ شکریہ!''

پیرس والے غسل خانے کا احوال ہم لکھ چکے۔ لندن میں مسز واٹسن کی سرائے میں جو گلوسٹر ہوٹل کے بھاری بھرکم نام سے معروف ہے۔ ہم دوسرے لوگوں سے ڈیوڑھا کرایہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے ایک کونے میں شاور بھی تھا۔ یعنی اس قسم کا ڈبہ جس کے اندر آدمی کھڑا تو ہو سکتا ہے لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا۔ سید سبط حسن نے کہا ''میاں کیا کیا جائے۔ اوپر کا آدھا دھڑ تو نہا لیا ہوں۔ ٹانگوں پر صابن کیسے لگاؤں، اور پانی کا تریڑا بھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''یوگ وِدّیا سیکھی ہے آپ نے؟''

بولے۔ ''ہاں کچھ کچھ تو پڑھا ہے۔''

''تو شیر شک آسن کیجئے''

''وہ کیا ہوتا ہے۔'' سیّد صاحب نے پوچھا۔

''سر کے بل کھڑے ہو جایئے اور ٹانگیں اوپر کھڑی کر لیجئے۔ پنڈت نہرو یہی کیا کرتے تھے۔ تبھی تو ان کو ہر چیز الٹی نظر آتی تھی۔''

''ان کا غسل خانہ بھی چھوٹا تھا کیا؟''

واللہ اعلم۔ ویسے چھوٹا نہ ہوتا تو ان کو سر کے بل کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی..... یا پھر پرانے زمانے کے شاعر کوچہ رقیب میں اس شان سے جاتے تھے لیکن نہرو جی شاعر تو نہ تھے اگرچہ شاعری کیا کرتے تھے۔

ہوٹل زیپلن میں بس یہ ایک تکلیف تو ہے اور تکلیف بھی کیا ہے۔ بھلا ہوا مری گگریا ٹوٹی پانی بھرن سے چھوٹی۔ نہ نہانے کا معقول عذر مل گیا۔ مسلمان یوں بھی جمعے کے جمعے نہاتا ہے اور اگلے جمعے میں ابھی کئی روز ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ مسز واٹسن کے ہاں ایک مہینہ گزارنے کے بعد تو اور بھی زیادہ آرام دہ معلوم ہونے لگا ہے۔ فرش پر قالین ہے۔ تولیے روز بدلے جاتے ہیں۔ مسز واٹسن سے اس روز سیّد صاحب نے نیا تولیہ مانگا تو بولیں۔ ''ڈیڑھ پونڈ روز میں تو نیا تولیہ ملنے سے رہا۔'' ہمارے اس کمرے میں چار روشنیاں ہیں اور ہم چاروں رات بھر جلائے رکھتے ہیں کیونکہ لندن والے کمرے میں ہمیں اپنے پلّے سے روشنی کرنی پڑتی بھی یعنی ہر دوسرے تیسرے دن میٹر کو رشوت دیتے تھے۔ اس کی جیب میں ایک شلنگ ڈالنا پڑتا تھا۔ .... جو خیریت مطلوب تک پہنچتے تھے اور غیب

سے مضامین آنے شروع ہوئے تھے کہ کھٹک سے بجلی بند۔ یہ شلنگ والی بجلی انسانی زندگی کی طرح ہے۔اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہم نے سوچا ماچس جلا کر اپنا کوٹ تلاش کریں کیونکہ معلوم نہیں کس کرسی، کس صوفے یا پلنگ پر پڑا ہے۔ کھونٹی پر ٹانگنے کے ہم قائل نہیں۔ پھر اس میں سے شلنگ نکالیں لیکن روشنی ہوتی تو ماچس ہمیں ملتی۔ خدا جانے کہاں رکھی ہو۔ پہلے ماچس ڈھونڈنا اور اس کوشش میں دھڑ ادھڑ چیزیں گرانا، پھر کوٹ ڈھونڈنا اور پھر اس کی کئی جیبیں، ان میں سے شلنگ ڈھونڈنا پھر میٹر ڈھونڈنا۔اس کا سوراخ ڈھونڈنا بڑا طویل عمل تھا۔ ہم نے خط اور مضامینِ غیب کے لیے اگلے روز کی تاریخ ڈال دی اور بستر پر دراز ہوگئے۔ رات کو جانے کس وقت سیّد سبطِ حسن آئے ہوں گے۔ ماچس جلائی ہوگی۔میٹر کا منہ شلنگ سے بند کیا ہوگا، اور روشنی پائی ہوگی، ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

+++++

ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے

جرمن کے متعلق سُنا تھا کہ مشکل زبان ہے۔جن کے لئے مشکل ہوگی، ہوگی، ہمیں تو اس کے سیکھنے میں چنداں دِقت نہ پیش آئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ ہماری طبعی ذہانت ہو۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم گوئٹے اور شلر کی زبان کی باریکیوں پر تنقید کر سکتے ہیں یا جرمن زبان کی صرف ونحو پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ہوٹل میں جا کر بے تکلفی سے کھانا مانگ سکتے ہیں اور راستہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک بڑی نادرروزگار کتاب ہمارے ہاتھ آ گئی جس میں کھانوں کے انگریزی نام اور ان کے جرمن مترادفات لکھے ہیں۔جس کی وجہ سے ہم کمرے کی کنڈی لگا کر خشک بسکٹ نگلنے اور پانی پینے سے بچ گئے۔ اس میں لکھا تھا کہ راستہ پوچھنا ہو تو پہلے کہو wo ist? جس کا مطلب ہے ''کہاں ہے؟'' اس کے بعد مقام مطلوبہ کا نام لو۔ازراہِ اخلاق BITTE (پلیز) بھی کہو۔وہ جواب میں کہے گا، ناخ ریشتس NACH RECHTS یعنی داہنی طرف یا ناخ لینکس NACH LINKS یعنی بائیں ہاتھ یا یہ کہ سیدھے چلے جاؤ۔ گیرادے اوس GERADEAUS اسکے بعد ہم دانکے شرن (شکریہ) کہو اور اپنی راہ لو۔ اب یہ تمام فقرات ہمارے وردِ زبان ہیں۔ عام طور پر ہمارا مطلوبہ مقام داہنے ہاتھ، بائیں کو یا سیدھا آگے ہوتا ہے، البتہ اگر کہیں ہم اسے پیچھے چھوڑ آئے ہوں اور ایک سے زیادہ موڑ مڑنے کی بات ہو یا ہمارا دیا ہوا پتہ شہر کے دوسرے حصّے میں یا کسی دوسرے میں ہو تو تھوڑی دِقت ہوتی ہے۔مخاطب جرمن میں ایک تقریر کرتا ہے۔ ہم یا......یا (ہاں۔ہاں) کہنے کے بعد سر ہلا کر دانکے شرن کہتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کوئی تو ملے گا جو ہماری جرمن زبان کی معلومات کے اندر رہ کر ہمیں بتائے گا، تُو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

''الانسان مرکب من الخطا والنسیان'' بے شک زبان پر ہمیں اس حد تک عبور حاصل ہوگیا ہے تا ہم احتیاطاً ہم یہ فقرے اور الفاظ ایک پرچی پر لکھ مع اردو حروف میں ان کے تلفظ کے، اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور یہ پرچی، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کتاب کا لکھنے والا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت اُبلے ہوئے انڈے کھانے کا شوقین تھا۔ ہم ہاف بوائلڈ کھاتے ہیں یا ہاف فرائیڈ۔ اُس نے اس باریکی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ لہٰذا ہمیں بھی سخت ابلا ہوا انڈا کھانا پڑتا ہے، یا پھر کل یہ ہوا کہ ہم نے بھُنی مرغی کا آرڈر دیا تھوڑی دیر میں بیرا یعنی بیری ایک بڑا سا قدحہ اٹھالائی معلوم

ہوا کہ ہم روا روی میں بھُنا مرغ HUHN BRAE کی بجائے HUHNER BRUHE (مرغی کا سوپ) کہہ گئے۔ زیادہ علم وسیع ہونے کا یہی تو نقصان ہے۔ ہم نے صرف ایک ہی لفظ یاد کیا ہوتا تو یہ قباحت کیوں ہوتی، ہم چاہیں تو جرمن زبان میں منشی فاضل کی ڈگری لا سکتے ہیں لیکن کیا فائدہ بلکہ دانستہ احتیاط کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں پولینڈ وغیرہ جانا ہے۔ ان لوگوں کی جرمنی سے لڑائی رہی ہے، کسی نے ہمیں جرمن سمجھ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بھی جو کچھ سیکھا ہے اسے ہم جرمنی کی سرحد پر بھلا کر آگے جائیں گے۔ جیسے اپنی فرنچ زبان ہم فرانس کی سرحد کے ادھر چھوڑ آئے ہیں۔ یوں بھی اتنا سامان کون اٹھائے اٹھائے پھرے۔

بون اور کولون میں گرجا اسی طرح ایک پر ایک چڑھے ہوئے ہیں جس طرح استنبول میں مسجدیں، اور شان میں بھی یہ استنبول کی مسجدوں پر چشمک زنی کرتے ہیں۔ کولون کے گرجا کو دیکھئے۔ اس کی رفعت وعظمت اور ہیبت آپ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ فرینکفرٹ سے آتے ہوئے ہم نے اُفق پر گرجاؤں کے نکیلے کلس بھی دیکھے ایک تو ان میں قلۂ کوہ پر بھی ہے خود ہمارے ہوٹل کے نواح میں پانچ چھ پرانے کلیسا ہیں۔ شام کو ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کیا دلاویز سریلی تانیں اڑا رہی تھیں۔ دل والوں کو برگ درختاں سبز ہی معرفت کردگار کے لئے کافی ہیں۔ یہ گھنٹیاں تو پھر صدا رکھتی ہیں۔

ایک تو تنہائی کا عذاب جس کے باعث بعض اوقات گھنٹوں بستر پر پڑے یورپ کا نقشہ دیکھا کرتے ہیں، پھر سیر کرانے والے دوکان اپنی بڑھا گئے۔ ہم نے پوچھا ٹورسٹ آفس سے کہ ہے کوئی جو ہمیں شہر دکھائے، دریائے رائن کی سیر کرائے اور اپنے ملک کے لئے ہم سے فارن ایکس چینج کمائے۔ لیکن جواب ملا ''نائیں'' یعنی نہیں۔ ۳۰ ستمبر کے بعد جاڑا فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ تمام تفریحی کاروبار ٹھپ، سیاح کو چاہیئے کہ کمرہ میں بیٹھ کے انگیٹھی تاپے آخر ہم نے خود ہی رائن کی راہ لی، معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہمارے ہوٹل کے پچھواڑے واقع ہے۔ یہ سیر ہماری بون میں آمد کا حاصل کہیئے، کیا خوبصورت سیر گاہ ہے، یا پھر ہم نے برسوں پہلے ہالینڈ اور بلجیئم کی سرحد کنوک کے ساحل پر ایسا پایا تھا۔ کشتیاں بھی آ جا رہی تھیں، لیکن ان پر جن منزلوں کے نام لکھے تھے وہ ہمارے نقشے میں نہ نکلیں۔ ممکن ہے چھوٹی بستیاں ہوں اور کیا عجب سو دو سو میل دُور ہوں لہٰذا ہم نے خطرہ مول نہ لیا۔ بنچ پر بیٹھ کر لوگوں کی طفلانہ شوخیوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں ہپّی وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن جوڑوں کا عالم یہاں بھی یہی ہے کہ

چھاتی سے لگا چوم لیا ہو گئے چپکے

پھر اٹھ کر کینیڈی پل کے ادھر سے دوبارہ شہر میں داخل ہوئے۔

اِدھر ہی کہیں بیتھوون کا گھر تھا۔ جی میں آئی کہ اسے بھی دیکھ چلیں۔ بیتھوون کا نام ہمارے جن قارئین نے نہ سنا ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ جرمنی کا نامور میراثی تھا۔ گانوں کی دھنیں بنایا کرتا تھا۔ ہم نے بھی ایک آدھ بار جب ریڈیو بند کرنا بھول گئے ہیں اس کی سمفنی سنی ہے۔ کیا بات ہے اس کی لاجواب آدمی تھا۔ ہم سے تو ایسی دُھن کبھی نہ بنے۔ ہم اپنی طرف سے تو ٹھیک چلے لیکن راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ ایک جگہ ایک مرد بزرگ، لانبی سفید داڑھی چہرے پر، دانش کی تحریر پیشانی پر، بھویں آنکھوں پر سایہ کئے ایک گلی کے موڑ پر کھڑے مل گئے۔ ہم نے تو جرمن میں پتہ پوچھا، جب جرمن آتی ہے تو کیوں نہ بولیں لیکن ان بزرگ نے انگریزی میں کہا بیتھوون کا گھر پوچھ رہے ہو صاحبزادے؟ وہ سامنے پھاٹک ہے ان کے اندر چلے جاؤ ہم نے کہا ''ہماری کتاب میں تو کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔'' اس پر دقیانوس نے فرمایا ''بیٹا جی! بیتھوون صاحب اب تمہیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ ملیں گے۔ وہ تو بہت دن ہوئے مر گئے۔ پھاٹک کے اندر چلے جاؤ۔ داہنے ہاتھ دیوار کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے۔''

اور یوں اس مرد دانا نے ہمیں بون کے ''قبرستان'' آلٹر فریڈہوف میں پہنچا دیا اور ہم نے بیتھوون کی ابدی آرام گاہ دیکھ لی اور وہاں سکوں کا وہ نغمہ سنا جو قبرستان کی چار دیواری کے باہر نہیں۔ یہ قبرستان اہلِ کمال کا گنجینہ تھا گویا جہاں جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر اور ان پر فلاسفروں،

سائنسدانوں، شہرہ آفاق طبیبوں، پروفیسروں کے ناموں کی تختیاں۔ ہر قبر پر سدا بہار پودے ہیں۔ کہیں کہیں چراغ نما لالٹین بھی، کیونکہ جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ قبریں زیادہ تو پچھلی صدی کی، کچھ اس صدی کے شروع میں مرنے والوں کی بھی، بعض دوسری جنگ سے چند سال پہلے کی بعض قبروں کے سرہانے مجسمے بھی تھے۔ عام طور پر ایک خاندان کی قبریں سب یکجا۔ اس وقت تک سب لوگ آ کر جا چکے تھے، ان درختوں کے سائے اور دم بدم اترتے ہوئے اندھیرے میں یہ دور دیس کا راہی تنہا تھا۔ کبھی گرے کا مرثیہ یاد آتا تھا، کبھی 'کل من علیہا فان' کا حکم۔ بڑے بڑے خطیب خاموش تھے۔ مسیحا نفس محوِ خوابِ عدم تھے۔ مشرق و مغرب کی فتح کا خواب دیکھنے والے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے والے، صحرا صحرا گھومنے والے، صاحبانِ انکشاف وایجاد، رہ لوزاں سیماب پا، اب اپنی اپنی دو گز زمین کے احاطے میں مست و مطمئن لیٹے آرام کر رہے تھے۔

؎ چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر

سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا'

+++++

کھانا ہمارا سیب

یہاں باڈ گوڈسبرگ میں ایک عظیم الشان ادارہ ہے جس کا کام کلچرل ایکس چینج کا انصرام وغیرہ ہے۔ اس کا جرمن نام ہم لکھیں تو یہ قباحت ہے کہ ہجے کی غلطی کر بیٹھیں گے۔ دوسرے وہ ایک آدھ سطر میں نہیں آئے گا۔ اٹھارہ اٹھارہ حرفوں کے الفاظ تو جرمن زبان میں عام ہیں لیکن اب یہ بھید کھلا کہ گھبرانے کی بات نہیں محمد حسن عسکری والے استاد صبر سہارنپوری کے کلام کی طرح یہاں حرفوں کو ملا کر لکھنے کا رواج ہے۔ کیلے کی گیلی جڑ کو یہاں کیلیکیلیکیلیجڑ لکھیں گے۔ آخر ہم بھی تو آبجشکو ملا کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والے اسے "آبجش بکو" پڑھتے ہیں۔ لکھنے میں جگہ بچتی ہے اور کاغذ کی مہنگائی تو عالمگیر ہے۔

ہم ہر چند کہ جرمن حکومت کے مہمان نہیں لیکن جس بین الاقوامی ادارے کے فرستادہ ہیں اس نے جرمنی کی حد تک ہماری دیکھ ریکھ اسی جرمن ادارے کے سپرد کر رکھی ہے اور واقعی نومان صاحب نے جو ہمارے پروگرام کے ذمہ دار ہیں، حق میزبانی خُوب ادا کیا اور مس مونیکا شمٹز تو مہربانیوں میں ان سے بھی بڑھ گئیں۔ بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو خوبے دیگری۔ قارئین کرام اپنے اسپ تخیل کو بے لگام نہ ہونے دیں اور بانوانِ پاکستان رشک سے اپنی انگلیوں کو نہ چبا ڈالیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

باڈ گوڈسبرگ ہی میں ہمارا سفارت خانہ ہے۔ ارشد الزمان سے ملنے وہاں گئے تو سفیر صاحب کو بھی سلام کیا۔ خان عبدالرحمٰن خان ہمارے بڑے کامیاب ڈپلومیٹوں میں سے ہیں لیکن طبیعت اور گفتگو میں بالکل سادہ، فرماتے ہیں، میاں میں تو دیہاتی آدمی ہوں، مجھ کو لکھنؤیت نہیں آتی، اور جرمن لوگ مجھے اس لئے پسند ہیں کہ سیدھے سادھے پٹھان لوگ ہیں۔ باتوں کے طوطا مینا نہیں بناتے۔ کوئی بات انھیں خوش آتی ہے تو ٹھیک ورنہ صاف جواب۔ پاکستان کے سچے دوست ہیں۔ مدد دینے میں دوسروں سے آگے، خود اعتمادی کے مالک ہیں۔ کسی کے دباؤ میں نہیں آتے، پھر بہادر ہیں۔ سارے جرمنی میں ایک بھی نکما یا احدی آدمی نہ ملے گا نہ کسی کو کمزور یا مدقوق پاؤ گے۔

گزشتہ اتوار کو کولون میں ہمارا سیب کھانے کو جی چاہا تھا۔ پونے دو مارک کے تین آئے تھے۔ آج دوپہر ہم مارکیٹ کی طرف جا نکلے تو

ریڑھی پر سیب دیکھ کر پھر جی للچایا اور انگریزی محاورہ بھی یاد آیا کہ سیب کھاؤ اور ڈاکٹر کو بھگاؤ۔ پاکستان میں تو خود ڈاکٹر سیب کھاتے ہیں اور فیس کا بتا کر ہمیں بھگاتے ہیں۔ ہم نے دکاندار سے کہا کہ یہ لو ایک مارک جتنے جی چاہے دیدو۔ اس نے ایک بڑا تھیلا اٹھایا اور اس میں پندرہ بیس بھر دیئے۔ ہم نے کہا اے بھلے مانس فقط ایک مارک کے دے، ہم خوردہ فروش دکاندار نہیں ہیں کہ ان سیبوں کی ریڑھی لگائیں، فقط ذاتی استعمال کے لیئے چاہتے ہیں۔ اس نے کہا جناب یہ ایک ہی مارک کے ہیں۔ وہاں سے جانا تو ہمیں کسی اور طرف کو تھا لیکن اس بوجھ کی وجہ سے سیدھے ہوٹل آئے۔

سیب کو بالعموم دانتوں سے یونہی کچر کچر کھایا جاتا ہے۔ آخر سبھی حیوان ایسے کھاتے ہیں تو انسان میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے لیکن اس وقت طبیعت ذرا مائل بہ نفاست تھی، ہم نے ہوٹل کی داروغن صاحبہ سے چاقو چھری وغیرہ کی فرمائش کی تا کہ کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ اتفاق سے وہ ڈکشنری جو جرمن زبان میں ہمارے علم وفضل کی ذمہ دار ہے ہم اوپر کمرے میں چھوڑ آئے اور چھری کی جرمن ہمیں زبانی نہیں آتی۔ داروغن صاحبہ کو انگریزی میں دخل ضرور ہے لیکن بس ایسا ہی، جیسا ہمیں جرمن میں ہے۔ ہم نے کہا ''نائف چاہیئے، ایپل کاٹنا ہے'' ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو ہم نے ایک ہاتھ میں خیالی سیب رکھ کر دوسرے میں خیالی چھری لی اور اسے کاٹا۔ بچاری کند ذہن پھر بھی نہ سمجھی۔ اب ہم نے بریک فاسٹ کا حوالہ دیا اور اشاروں اشاروں میں توس پر چھری سے مکھن لگایا۔ یہ اشارہ بھی مکھن لگانے سے زیادہ نائی کے اُسترا تیز کرنے سے زیادہ قریب ہوگیا۔ لہٰذا ہم نے خیالی سیب کو پھر دو ٹکڑے کیا۔

یکا یک محترمہ نے چہک کر کہا ''سیوب''؟

ہم نے بھی خوش ہو کر کہا ہاں ''سیب''۔ اتنی دیر سے یہی تو کہہ رہا ہوں کہ سیب کاٹنا ہے۔ اب لاؤ چھری۔''

ایک روز ہم نے پائن ایپل مانگا تو دوکاندار نے کہا ''اناس؟'' تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں یہ پھل اناس ہی کہلاتا ہے۔ اب یہاں بھی ہم اتنی دیر سے ''ایپل'' کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ شروع ہی میں سیب کہہ دیتے تو یہ فوراً سمجھ جاتیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کسی نے اُردو اور جرمن زبان کے مشترک الفاظ پر اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ کسی کو جرمن آتی ہی نہیں تھی۔ ہم نے طے کیا کہ عدیم الفرصتی کے باوجود وطن واپس جا کر ہم اس موضوع پر محققانہ مقالہ لکھیں گے۔ ایک تو یہ سیب ہی مشترک نکلا اور بھی بہت سے الفاظ ضرور مشترک ہوں گے۔

اتنے میں محترمہ برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نہانے کے صابن کی ایک ٹکیہ تھی۔ بولیں ''یہ لو سیوب''

+++++

آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں

برلن۔ برلن۔ برلن! اے صاحبو حفاظتی بند باندھ لو، برلن آیا جاتا ہے کسی اور شہر کے سواد میں جی پر وہ ہیبت طاری نہیں ہوتی جو برلن پہنچنے پر ہوتی ہے بشرطیکہ آنے والا کھالوں کا تاجر اور محض ایکسپورٹر نہ ہو۔ یہ شہر ہے پرشیا کی سطوت وجبروت والے بادشاہوں کا۔ شاہ فریڈرک اعظم کا، پرنس بسمارک کا، قیصر ولیم کا، ہٹلر کا، آگ اور دھوئیں کا۔ ملکوں کی قسمتوں، کروڑوں انسانوں کی تقدیروں کے اعلان یہاں سے ہوتے تھے۔ نوشتے یہاں سے جاری ہوتے تھے۔ یہ سڑکیں جن پر اب شگفتہ چہروں والے لوگ چل رہے ہیں اور میں آزاد ہم بے غل وغش قدم مار رہے ہیں۔

یہاں گستاپو کا عمل تھا۔ نازیوں کے حیش پریڈیں کرتے گزرتے تھے۔ سوستیکا کا جھنڈا لہراتا تھا۔ مائیکروفونوں سے فیوہرر کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ زنداں آزادی پسندوں سے بھرے تھے۔ نواحات بندی خانوں سے آباد تھے جہاں لاکھوں بے بس انسانوں کو گیس کی بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ ان کی چربی سے صابن بنتا تھا۔ ان کی ہڈیوں سے کھاد بنتی تھی۔ اتحادیوں نے آ کر ان بندی خانوں کو دیکھا تو فقط زندوں اور مردوں کے ڈھانچے پائے یا گودام در گودام انبار در انبار بچوں اور بڑوں کے جوتوں کے جوڑے، ان کے جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور آج یہ بلدہ پھر شہر ہے خوشحال، خوش باش اور خوش نہاد لوگوں کا۔ انسان عظیم ہے خدایا!

ہمارے میزبانوں کی فرستادہ ایک لڑکی ائیر پورٹ پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ خوش آمدید۔ ہم نے کہا "اے بی بی کیا نام ہے تیرا؟"

بولیں: "سُو"

"بہت چھوٹا نام ہے سُو" ہم نے کہا "اے نیک بخت! ہم دنیائے سُو اور مردمان سُو اور علمائے سُو نہ جانے کس کس سے بچتے یہاں تک پہنچے ہیں تو ہمیں اپنا اصلی نام بتا۔" تب بولی "بندی کو فرانسسکا کہتے ہیں" ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ فرمایا مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وضاحت بھی کردی، صبح سے شام تک۔ ہم نے کہا اچھا تو ہمیں اپنا شہر بھی دکھاؤ گی تب اس نے جیب سے ایک لانبا کاغذ نکالا جو چھپا ہوا تھا۔ "پروگرام برائے حضرت ابن انشا آف اسلامک ری پبلک آف پاکستان" ہم نے کہا۔ ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اتنے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔ اتنی لائبریریوں کو ملاحظہ نہیں فرما سکتے، سخن کو مختصر کرو۔ ہم سے بون ہی میں نیومان صاحب نے کہہ دیا تھا کہ برلن جا کر کام کے جھمیلوں میں نہ پڑ جانا کچھ شہر بھی دیکھنا۔ بولیں اب تو پروگرام بن چکا۔ ان لوگوں کو اطلاعیں ہو چکیں۔ اب ان کو منسوخ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے کہا ہم برینڈن برگ گیٹ پر کب جائیں گے، دیوار کب دیکھیں گے، مولوی محبوب عالم کا ہوٹل کب تلاش کریں گے۔ پھر مشرقی برلن بھی ہمیں ضرور جانا ہے۔ ہم نے بون میں تمہارے دفتر سے کہہ دیا تھا لیکن وہ بچاری کیا کر سکتی تھی۔ بولی، شامیں آپ کی خالی ہیں۔ بیچ میں بھی کہیں کہیں ایک دو گھنٹے آپ کو مل جائیں گے۔ ان میں آپ چاہیں تو شاپنگ کر لیں۔ ہم نے کہا بی بی شاپنگ کی بات ہم سے نہ کر کہ ہم تو خود اپنے کو بیچنے نکلے ہیں۔ کوئی دل و جان کا اچھا خریدار ملے تو ہمیں بتانا۔

برلن کہنے کو چار حصے ہیں لیکن واقعتہً الگ فقط مشرقی حصہ ہے سوویٹ سیکٹر۔ دیوار کے پچھلے۔ باقی تینوں یعنی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سیکٹر باہم ملے ہوئے ہیں، انتظام سب کا اکٹھا ہے، کوئی چوکی پہرہ نہیں۔ آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان تینوں میں سے آپ کس سیکٹر میں ہیں۔ سوویٹ سیکٹر یعنی مشرقی برلن، وہ البتہ!

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام KURFURSTEN ہے اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نکلی ــــ "کفرستان" اسی پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا:۔ "ہوٹل کفرستان" یعنی کفر کا دم چھلہ یہاں بھی ہمارے ساتھ رہا۔

یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ہم نے پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک کے آدمی کے لیئے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرر کیا۔ پھر اس خیال سے چپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور اس شاہراہ پر" بتانِ کافر" سے مڈ بھیڑ ہوا کرے گی۔ کیا عجب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے، اور کوئی ان میں سے راہ راست پر آ کر ہمارے دستِ حق پرست پر بیعت بھی کر لے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کسی کافر کو تو ہم اپنی راہ پر نہ لا سکے۔ ہاں ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا۔

ہوٹل ہمارا اچھا تھا۔ اتنے دنوں بعد ڈھنگ کا ہوٹل رہنے کو ملا۔ یورپ میں نجی باتھ روم والا ہوٹل ایک نعمت ہے جو پہلی بار نصیب ہوئی۔ ورنہ کسی نہ کسی حاجت (ضروریہ وغیر ضروریہ) کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ جو لاٹا لائے گو ہم نے خاص اسی مطلب سے خریدا۔

فرینکفرٹ والا ہوٹل زیپلن بھی اچھا تھا لیکن اس کے مقابلے میں نمبر دو۔ بون کا ہوٹل بنز نسبتاً سستا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن منیجر صاحب نے بل بنایا تو اس میں تین مارک کسی چیز کے الگ لگے تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا۔ بولیں آپ ایک روز نہائے جو تھے۔ غسل خانہ مشترک سہی لیکن آپ نے استعمال جو کیا ہے تو اس کے پیسے بھی دیجئے۔ ہم نے شکر کیا کہ چار دن میں فقط ایک بار نہائے ورنہ ہم اپنے حلقے میں پانی کا جانور کہے جاتے ہیں۔ روز نہاتے ہیں۔ ہوٹل بنز میں بھی ہم سے یہ حرکت ضرور ہوتی لیکن ہمیں غسل خانہ ملا ہی نہیں تھا۔ پوچھنا پڑا کہ آخر یہ چیز ہے کہاں؟ معلوم ہوا اُوپر چھت پر ہے۔ بیت الخلا میں البتہ آپ بغیر پیسے دیئے مدار پر جا سکتے ہیں۔ بل میں تین مارک اور لگے تھے۔ ہم نے کہا اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔ فرمایا آپ کے کمرے میں گرم کرنے کی سلاخیں لگی ہیں نا؟ یہ تین مارک HEATING کے۔ ہم نے کہا وہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کیں بلکہ رات کو کھڑکی کھول لیتے تھے تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ کمرے میں تو حبس تھا۔ بولیں: استعمال نہ کرنے کی سند نہیں ہے، پیسے تو دینے ہوں گے۔ ہم نے حساب جوڑا تو وہی پایا جو اچھے ہوٹل کا ہوتا ہے۔

صرف کفرستان ہی نہیں اور بھی کئی لفظ ہم نے اپنے حساب سے یاد کئے ناشتے کے لئے جرمن میں بڑا ٹیڑھا لفظ ہے FRUSTUCK ناشتے کے کمرے پر لکھا نظر آیا FRUSTUCKRAM ہم نے کہا وہ مارا یہ فرس تکارام کی خرابی ہے۔ سنت تکارام کا نام کس نے نہیں سنا۔ اگرچہ یہ کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ قارئین کرام کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں۔ فرس کا مطلب گھوڑا۔ یعنی سنت تکارام کا گھوڑا۔ ظاہر ہے سنت صاحب کے زمانے میں گھوڑے ہی کی سواری ہوتی ہوگی لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جرمنوں نے ناشتے کے کمرے کے لئے یہ بے تکا نام کیوں رکھا۔ گھوڑے کو ناشتے کے کمرے سے کیا نسبت، تا آنکہ یہ رعایت ملحوظ نہ ہو کہ دِلّی والے بھی نہاری کھاتے ہیں اور پنجاب میں تانگے کے گھوڑوں کو جو بھوسی چنے وغیرہ دیئے جاتے ہیں وہ بھی نہاری کہلاتے ہیں۔ ہماری تحقیق کا ٹٹو تو اس میدان میں یہیں تک جاتا ہے آگے اپنے فیلِ معنی کو محقق نکالیں۔

ہوائی سفر کے آرام پر سب کی نظر ہے لیکن اس کی قباحتوں اور صعوبتوں کو وہی جانتا ہے جو اس سے بار بار گزرے اور جسے اپنے اسباب کا وزن حد میں رکھنے کے لئے اُسے بار بار کانٹے سے تولنا پڑے اور چیزوں کو پھینکنا پڑے۔ ہم تمام مسافروں کے مقابلہ میں دس کلو زیادہ لے جانے کا حق رکھتے ہیں کُل تیس کلو یعنی چھیاسٹھ پونڈ، لیکن لندن سے چلے تو سترہ کلو زیادہ تھے۔ جس کے پیسے الگ دینے پڑے، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں کوئی چیز غیر ضروری ہوتی ہے۔ ہم محتاط آدمی ہیں کچھ وزن تو ہمارے ساتھ چورن اور ہاضمے کی گولیوں کا ہے، اتنا لمبا سفر ہے اس لئے ہم نے خاصا ذخیرہ ساتھ رکھا ہے۔ ہیئر آئل کی بھی چند شیشیاں ہیں جانے کب ختم ہو جائے پردیس میں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے کہ ہمیں روغن آملہ خاص الخاص یا باون جڑی بوٹیوں والا تیل چاہیئے۔ کچھ پرانے رسالے نقوش اور فنون کے سالنامے اور بعض ضخیم ناول اور تنقید کی کتابیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ تنہا آدمی کا جی گھبراتا ہے۔ مطالعے کے لئے ساتھ کچھ نہ کچھ رہنا ہی چاہیئے۔ ایک سیٹ ہمارے ساتھ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کی کتابوں کا بھی ہے جن کی مدد سے ہم عربی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں قاہرہ وغیرہ جانا ہے اور جامع ازہر کے شیخ سے گفتگو کرنی ہے۔ کچھ پرانے رسالے ہم نے لندن سے خریدے۔ پھر ہر شہر کے نقشے، گائیڈ بکس وغیرہ بھی ہیں۔ ہمارا جی تو انسائیکلو پیڈیا برٹینکا بھی ساتھ رکھنے کا تھا کیونکہ پردیس میں معلومات کی بڑی ضرورت رہتی ہے لیکن بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی محدود ہے، کیونکہ منڈی میں اناج کی بوریاں ڈھونے کا کام ہم نے نہیں کیا۔ یورپ میں قلی نہیں ملتے اور سوٹ کیس، گٹھریاں، پوٹلیاں، بریف کیس، تھیلے، اتنا کچھ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم گنتی تک بھول جاتے ہیں۔ یورپ والے کوئی چیز دیتے ہیں تو اس کا تھیلا اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ پوٹر کہیں مل گیا تو اس کا منہ موتیوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بس نے فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے کے غلط دروازے پر اتار دیا تھا۔ پوٹر نے صحیح دروازے تک پہنچایا۔ ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش گیا لیکن اس بندہ خُدا نے تکرار کی کہ چار پانچ قلی یا ... تین ٹرنک سر پر ہیں، آپ کے بستر کیس کو

جس میں دو رضائیاں، کمبل، جوتے اور کرائے سے بچنے کے لیئے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے، اپنے کاندھے میں حمائل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلا اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کہنی سے لٹکا ہوا۔ بوجھ سے لہراتا ہوا چلتا ہے، پل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں اس کے بعد التجا کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بعضے نیک دل دونی چونی دے دیتے ہیں۔ بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک آنہ فی نگ فی پھیرا کرایہ تھا۔ اکنی کی شکل بھی بنی رہتی تھی کہ کوئی زیادہ مانگے تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس رپورٹ کی جائے۔ اب شاید دونی یا چونی کا ریٹ ہے۔ گاڑی چل دیتی ہے تو ہمارا یہ بھائی پاکستان کی روزافزوں ترقی اور اقبال مندی کا حصہ دار لال پگڑی سر کے نیچے رکھ پلیٹ فارم پر آرام کرنے کو لیٹ جاتا ہے اپنے روشن مستقبل کی ٹرین کے انتظار میں، جس کا سگنل نہیں گرتا، جو نہیں پاتی۔

جب سے ہوائی سفر کا رواج ہوا ہے، لوگوں میں باہم محبتیں بھی کم ہوگئی ہیں، خلوص بھی رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر پیٹی باندھے اکڑا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ پاس والے سے کلام کرے، اس کی خیریت پوچھے، ذات پات وطن دریافت کرے۔ مسائل حاضرہ پر چندے گفتگو ہو، کچھ آل اولاد کے کوائف دریافت ہوں، کتنے بچے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ کتنوں کی شادی ہوچکی، جہیز میں کیا آیا۔ کشمیر کب آزاد ہوگا۔ عرب کیسے جیت سکتے ہیں۔ سچا مسلمان بننے کی کیوں ضرورت ہے۔ نئی نسل میں بے راہ روی اور بے شرمی کیوں پھیل رہی ہے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہوائی سفر میں آزادی بھی محدود ہے۔ آپ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چادر بچھا کر پوری برتھ پر پاؤں نہیں پسار سکتے جیسے ہم تھرڈ اور انٹر میں کرتے ہیں۔ نہ ٹرنک اور پیٹیاں پھیلا کر دوسرے مسافروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ پھر ریل میں آپ کے پاس آموں کی ٹوکری ہے، مزے سے آم کھایئے اور اس کی گٹھلیاں فرش پر پھینکیئے۔ کسی کی کیا مجال جو ٹوک سکے۔ اگر لمبا سفر ہے اور برانچ لائن ہے۔ آپ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے تو حقہ بھی ساتھ رہنا چاہیئے اور تمبا کو کو اور اُپلوں کا تھیلا بھی۔۔۔ اُپلے نہیں تو گاڑی کے فرش پر کاغذوں سے آگ جلا لیجئے۔ دھوئیں کا کیا ہے کسی صورت باہر نکل جائے گا۔ جہاز کے سفر میں تو چڑھتے اترتے وقت ''نو اسموکنگ'' کا حکم رہتا ہے اور اس بے آرامی کے کھڑاگ کا نام کیا رکھا ہے۔۔۔''ہوائی جہاز''

ہت تیری ہوائی جہاز بنانے والے کی۔

+++++

برلن۔۔۔ ہمارا اور منشی جی کا

ہم جن گائیڈ بکوں کی مدد سے بلاد یورپ کا سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی ہے جس کا نام ہے ''یورپ میں پانچ ڈالر روز میں گزارا کیسے کیا جائے''۔ اس میں جگہ جگہ کے ہوٹلوں، سراؤں، ڈھابوں اور سستے ٹھکانوں کے پتے دیئے گئے ہیں۔ یہ سال بھر پرانی ہے۔ اس لئے بہت سی باتیں غلط ہوگئی ہیں بلکہ ہمارے تو یہ کسی کام نہ آئی۔ استنبول میں ہمارے دوستوں نے ڈیڑھ ڈالر روز کا ہوٹل تلاش کر کے مصنفِ کتاب کو زک دی اور ولایت میں کہیں ہمارا گزارا آٹھ دس ڈالر سے کم میں نہیں ہوا۔ دوسری گائیڈ بک کی بتائی ہوئی ہدایتیں بھی بہت دُور از کار ہیں۔ اوّل تو اس کا مصنف، ہلٹن ہوٹل سے کم میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ دوسرے اس کے سال طباعت ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک دنیا بدل گئی ہے۔ تیسری کتاب کے بتائے ہوئے اَتے پتے البتہ بہت جگہ صحیح نکلے۔ یہ اصل میں ایک سفرنامہ ہے۔۔۔ آج سے سڑسٹھ سال پہلے،

۱۹۰۰ء کے سفر کا۔ تصنیفِ لطیف منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ وزن اس ضخیم کتاب کا کوئی دو پونڈ کے قریب ہوگا۔ ہوائی سفر میں ہر بار جو ہمیں زائد اسباب کا جرمانہ دینا پڑتا ہے وہ بڑی حد تک اسی کتاب کے باعث ہے۔

برلن میں اس کتاب نے ہمیں بہت دوڑایا۔ ہم نے پوچھا فریڈرش سڑاس کہاں ہے تاکہ قیصر ہوٹل دیکھا جائے۔ جہاں مولوی صاحب ٹھہرے تھے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ یہ سڑک تو مشرقی برلن میں ہے اور بہت طویل ہے۔ پہلے اس ہوٹل کا مکان نمبر تو معلوم ہو۔۔۔ پھر چاہے ہوٹل رہا ہے یا نہیں رہا ہے۔ کم از کم وہ پرانی عمارت یا جائے وقوع تو دیکھ لو گے۔ لہٰذا پہلی جستجو پرانی ڈائرکٹریوں کی ہوئی۔ یہ مغربی برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مل گئیں جہاں یہ لوگ ہمیں لاطینی زبان کے مخطوطے دکھانے لے گئے تھے۔ ۱۹۱۷ء کی ڈائرکٹری ہاتھ آئی۔ اس میں قیصر ہوف نامی ہوٹل کا پتہ درج تھا۔۔۔ کسی اور سڑک کا ہم نے کہا۔۔۔ یہ نہ چاہیے۔۔۔ سب سے پرانی ڈائرکٹری اس ذخیرے میں ۱۸۷۰ء کی تھی۔ اس میں بھی دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ہم نے کہا۔ بس اس سال کی دیکھنی چاہیے، ۱۹۰۰ء کی۔ خوش قسمتی سے مل گئی اور اس میں پتہ بھی صحیح تھا۔ مکان نمبر بھی دیا تھا ۱۷۸، مالک کا نام اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا نمبر ۶۳۷۔

دوسری چیز جس کی ہمیں تلاش تھی وہ برلن کے ایک پرانے اخبار ''برلنیر ٹاگ بلاٹ'' یعنی ''روزنامہ برلن'' کا ایک پرچہ تھا۔ منشی جی نے برلن پہنچتے ہی پانچ چار اخباروں کے ایڈیٹروں کو ملاقات کے لئے خط لکھ دیئے تھے۔ قریب قریب سب کے جواب دوسرے روز مل گئے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ ''برلنیر ٹاگ بلاٹ، جو یہاں کا اوّل درجے کا آزاد اور انٹرنیشنل اخبار سمجھا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر لیوی سن نے میرے خط کا جواب بذریعہ ''اورہ پوسٹ'' یعنی دم کشی کی ڈاک سے اسی سہ پہر کو بھیج دیا تھا۔ یہ طریقہ خط بھیجنے کا بھی برلن میں عجیب ہے۔ جس خط کو شہر کے دوسرے حصے میں بھیجنا مطلوب ہو، اس پر معمولی ڈاک سے دو چند محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ خط ایک نلکوں کے سلسلے کے اندر سے بذریعہ ہوا کے زور کے پہنچائے جاتے ہیں۔ یعنی نلکے میں خط ڈال کر پیچھے مشین کی ہوا سے دھکا دیا اور دم زدن میں منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جہاں سے تار کی طرح جلدی ہی تقسیم کر دیئے گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں بھی یہ طریق ڈاک کا جاری ہو گیا ہے اور پیرس میں بھی۔

غرض چٹھی پاتے ہی میں ۷، جولائی کو ۸ بجے شام کے مقررہ وقت پر ''برلنیر ٹاگ بلاٹ'' کے دفتر میں پہنچا۔ ڈاکٹر لیوی سن اپنے کمرے سے باہر نکل کر مجھے اندر اپنے ساتھ لے گیا۔۔۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی اور گورنمنٹ سے رعایا کے تعلقات پر گفتگو ہوئی اور جب میں نے سمجھایا کہ کانگریس والے وہی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں جو کسی زمانے میں فریق مقابل گورنمنٹ (اپوزیشن) ادا کرتا ہے تو اس کا ظن رفع ہوا کہ رعایا سرکار سے ناراض نہیں۔

میرے پاس پیسہ اخبار کا نمونہ موجود تھا۔ جرمن ایڈیٹر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کی قیمت کی ارزانی اور مقدار اشاعت دونوں باتوں کو پسند کیا بلکہ مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور اپنے دوسرے روز کے اخبار میں میری ملاقات کی کیفیت معہ پیسہ اخبار کے ایک کالم کے فوٹوگراف کے چھاپ دی۔''

ہم محقق نہیں ہیں لیکن محققوں کے تلمیذِ رشید تو رہے ہیں، اور گو کسی کالج یونیورسٹی میں آج کل نہیں پر واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ رجحان ہمارا اہلِ علم ہی کا سا ہے کہ قلی دکنی کے بیٹے کے ختنوں کی صحیح تاریخ معلوم ہونی چاہیے خواہ اس کے لئے کسی کو پی ایچ ڈی کیوں نہ بنانا پڑے۔ پس ہم اس مسئلے سے پیچ گئے کہ یہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے اور اس کا فوٹو لیکر چھپوانا چاہیئے تاکہ صاحبانِ تحقیق میں ہمارا نام لکھا جائے۔ سب سے پہلے تو ہم فرینکفرٹ یونیورسٹی میں گئے اور اس اخبار کا اَتا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی فائل فرینکفرٹ بھر میں نہیں ہے۔ پھر کولون اور بون میں جاتے لائبریریوں کے پھیرے کیئے۔ یہ متاع یہاں بھی نہ ملی۔ مغربی برلن پہنچتے ہی ہم نے میزبانوں سے کہا کہ ہاتھی نہیں چاہیئے گھوڑا نہیں چاہیئے بس ''برلنیر ٹاگ بلاٹ'' کا یہ پرچہ چاہیئے۔ وہ بھی کئی دن تک ہمیں لیے مختلف کتب خانوں میں دوڑا کیا لیکن خالی ہاتھ

واپس آئے۔ ایک لائبریری یہاں کی مایہ ناز گنی جاتی ہے۔ایک اونچی عمارت ہے، لاکھوں کتابیں ہیں۔ ہمیں اس کے کرتا دھرتا بڑے آدر کے ساتھ لے گئے تھے کہ ہم دیکھ کے تعریف کریں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن اگر جولائی ۱۹۰۰ء کا ''برلینیر ٹاگ بلاٹ'' تمہارے پاس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

تب ہم نے کہا اب ہم مشرقی برلن جاتے ہیں۔

یہ ظالم ہمارے مغربی جرمنی کے میزبان ہمیں لوگوں سے ملانے اور لائبریریاں دکھانے میں اتنا مصروف رکھتے تھے کہ مشرقی برلن جانے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ آخر میں لائبریریوں سے ہم یہ کہہ کر بھاگے کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سیدھے سٹاڈبان کے اسٹیشن پر پہنچے۔ سٹاڈبان اے سادہ لوح قارئین کرام کسی جگہ یا چڑیا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص ریل کی سواری ہے۔ اس کے ڈبوں میں بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے تو پھر یہ کیا ہے؟ ہمیں برلن جانے سے پہلے ہی منشی محبوب عالم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔

''شہر کے اندرونی حصہ کے گرد اور عام طور پر شہر کے اندر ایک حلقہ ریل کا گزرتا ہے جس کی سڑک یک منزلہ مکانات کی چھتوں کے برابر یا بیس فٹ بلند ہے اور اس سڑک کے نیچے ۶۶ پل شہر کے اندر ہیں۔ جرمن اس کو سٹاڈیان یعنی شہر کی ریل کہتے ہیں اس کے اسٹیشن دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ گاڑی ہر پانچ منٹ کے بعد ہر اسٹیشن سے دونوں طرف روانہ ہوتی ہے اور نصف منٹ سے زیادہ کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی۔ اس ریل کو پرنس بسمارک نے تجویز کیا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے کوئی شخص نوکر نہیں البتہ چند مشینیں لیٹر بکسوں کی طرح کھڑی ہیں جب کوئی ان میں فینی کا سکہ ڈالتا ہے، جھٹ ایک ٹکٹ تیسرے درجے کا ان کے منہ سے گر پڑتا ہے۔''

سڑسٹھ سال میں اگر اس معمول میں کوئی فرق ہوا تو یہ کہ اب ریل پانچ کی بجائے ہر پندرہ منٹ بعد چھوٹنے لگی ہے اور ٹکٹ دینے کا سلسلہ آٹومیٹک نہیں رہا بلکہ آدمی کھڑکی میں بیٹھا پیسے لیتا ہے ٹکٹ دیتا ہے۔ آٹومیٹک سلسلہ ہم نے فقط مشرقی برلن کی بسوں میں دیکھا۔ اس فرق سے قطع نظر پل وہی راستے وہی ہیں، اسٹیشن وہی ہیں اور کچھ گاڑیاں بھی وہی ہیں جن میں ہمارے منشی صاحب بیٹھتے رہے ہیں۔ ہم بھی بیٹھ کر اترے تو مشرقی برلن میں اسی اسٹیشن پر اترے، جہاں سے منشی صاحب چڑھتے اترتے ہوں گے۔ فریڈرش سٹراس کا اسٹیشن۔ سٹراس کا مطلب روڈ ہے۔ ہر سڑک کا نام اس پر تمام ہوتا ہے۔

مشرقی برلن کا کسٹم والا ہمارے تھیلے کے کاغذوں کتابوں کی پڑتال میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا رہا تھا بلکہ ہمارا ایک آرٹیکل ایک جرمن رسالے میں چھپا ہے وہ بھی شومئی قسمت سے بستے میں تھا۔ اس کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہم نے کہا اے بھیا۔ چھوڑ اسے۔ اپنے پاس رکھ لے اور ہمیں اسٹیٹ لائبریری کا پتہ بتا۔ اس پر وہ بھلا مانس چونکا اور کہا۔ ''جاؤ فریڈرش سٹراس سے انٹرڈن لینڈن بائیں ہاتھ مڑو۔ تھوڑی دور بعد بائیں ہاتھ کو اسٹیٹ لائبریری ہے۔۔۔''اسٹاٹ ببلیوتھک'' آٹھ بجے تک کھلی رہے گی۔''

ہم نے مشرقی برلن کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور دوکانوں کا مطالعہ آیندہ پر چھوڑا اور لائبریری کا رُخ کیا۔ بڑی پرشکوہ عمارت ہے۔ چوڑے پاٹ کی سنگین اور بلند و بالا، جنگ میں ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا لیکن زیادہ تر بچ رہی، کتنی ہی سیڑھیاں چڑھنے اور غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد رسالوں اور اخباروں کا شعبہ آیا۔ بہت سے لوگ سر جھکائے پڑھ رہے تھے۔ فائل مختلف میزوں پر پڑے تھے۔ ایک بی بی لائبریرین سر جھکائے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہم نے عرضِ مطلب کیا کہ ہم نے برلینر ٹاگ بلاٹ کی تلاش میں آہنی پردے کے پیچھے آئے ہیں۔ ہمارا سوال پورا ہونا چاہیے۔

یہ محترمہ بہت کم انگریزی جانتی تھیں۔ اٹک اٹک کر بولتی تھیں۔ فرمایا ''مل تو جائے گا لیکن کل، جو صاحبہ انچارج ہیں وہ موجود نہیں، پانچ بجے چھٹی کر جاتی ہیں۔''

ہم نے کہا ''ہم عمر میں پہلی بار برلن آئے ہیں اور آج جا کر شاید نہ لوٹ سکیں کچھ کرو کا مریڈ ہمارے لئے۔''

بچاری بہت اچھی تھیں۔ ہم نے بات میں زور پیدا کرنے کے لئے کہا ''ہمارے دادا یہاں آئے تھے۔ ان کا ذکر اور ان کے اخبار کا فوٹو اس میں چھپا ہے (ہمارے نہ سہی ہمارے دوست حبیب عالم کے دادا تو تھے) رشتے کے حوالے سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور بچاری نے ایک لمبا فون کیا، اور پھر خود اُٹھ کر گئیں۔ آدھے گھنٹے میں ایک فائل نکال کر لائیں، اور جولائی ۱۹۰۰ء کا برلینر ٹاگ بلاٹ ہمارے سامنے تھا۔

ہمارے منشی جی ے، جولائی کو اس کے ایڈیٹر سے ملے تھے اور ان کے بیان کے مطابق دوسرے دن کے پرچے میں پیسہ اخبار کا فوٹو چھپا تھا۔ ہم نے ۸، جولائی کا پرچہ نکالا۔ اس میں کچھ نہ پایا تو ۹، جولائی میں جھانکا کہ شاید، پھر دس جولائی، گیارہ جولائی، بارہ جولائی، تیرہ جولائی، چودہ جولائی۔۔۔آخر مایوس ہو کر فائل بند کر دیا محنت اکارت گئی۔ پیسہ اخبار کا عکس کہیں نظر نہ آیا۔ جی میں طرح طرح کے وسوسے آئے۔ منشی جی نے یونہی تو نہیں اڑا دی تھی۔ احتیاطاً ہم نے سات کا پرچہ بھی دیکھ ڈالا، آٹھ، نو، دس کا ایک ایک کالم بہ نظر غائر پھر دیکھا۔ یہ تراشہ ہمیں نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر اس بی بی سے ہم نے کہا۔ ''ابھی اخبار لوٹائیے نہیں۔ کل ہمیں وقت ملا تو پھر آئیں گے۔''

دل میں عجب دبدھا سا تھا۔ سفر نامہ آ کر دوبارہ پڑھا۔ اس میں وہی دوسرے دن کا حوالہ تھا۔ تیرہ کو تو منشی جی برلن سے چلے ہی گئے تھے، انھیں دھوکہ ہوا کیا؟

اگلے روز دیکھنا تو ہمیں ہسٹری کا میوزیم بھی تھا کیونکہ پہلے روز لائبریری میں اتنا وقت لگا کہ میوزیم بند ہو رہا تھا، لیکن قدم کشاں کشاں لائبریری ہی میں لے گئے۔ اب ہم نے سوچا کہ ٹھہر کر پورے مہینے کا پرچہ دیکھیں گے۔ چودہ کے بعد پندرہ جولائی کے شمارے کے آٹھ صفحے الٹے تھے کہ نویں صفحہ پر پیسہ اخبار اور اردو تحریر نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔ منشی صاحب کے متعلق جو ذرا سی بدگمانی ہوئی تھی۔ اس پر افسوس بھی ہوا۔ یہ عکس ''پیسہ اخبار'' یوم شنبہ ۱۴، اپریل ۱۹۰۰ء کے ادارتی کالم کا تھا۔ سرخی تھی۔

''تعلیم اسلام حکومتِ انگریزی کی کیسی موید ہے۔''

سرخی کے نیچے ایڈیٹر کا نوٹ:۔

''حال ہی میں دو یوروپین افسروں کے ایک جاہل سرحدی آدمی کے ہاتھ سے بلا وجہ قتل کیے جانے پر جو رائے میں پیسہ اخبار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسی شقاوت اور سفاہت کی کاروائی کسی طرح بھی باعث ثواب نہیں ہو سکتی، اور نہ کوئی سچا مذہب اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک ضروری سرحدی اسٹیشن کے تمام معزز طبقہ کے مسلمانوں کی رائے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ میں ان کالموں میں اسے نمایاں جگہ دیتا ہوں۔''........(ایڈیٹر)

اس کے نیچے کی تحریر کس کے قلم سے ہے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کالم کا اختتام ایک نامکمل فقرے پر ہوتا ہے۔

+++++

رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک

یورپ والوں کی خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ ہیں کم سواد۔ ہو سکتا ہے ہم غلط لوگوں سے ملتے رہے ہوں۔ بہر حال ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ہر چند ہم نے بات سے بات نکال کر جتایا کہ ہم شاعر ہیں۔ کسی نے خاص اعتناء نہ کی۔ ہمارا دیوان جیسا بستے میں ہم نے باندھا تھا ویسا بندھا

ہے۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔۔کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری؟ ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الیکٹرانکس ہے۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ الیکٹرانکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن از راہِ مصلحت باز رہے۔۔ ایک ادارہ کتابیں تیار کر رہا ہے۔ جو پاکستان بھی آئیں گی، ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ معلوم ہوا دھاتوں پر کیمیاوی اثرات، ویلڈنگ، خراد اور آئل ٹیکنالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کرید کی کہ علم بدیع و معانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو۔ اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعتِ توشیح، مراعات النظیر، بے نقط وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم، اے میں پڑھی تھیں، ان پر کچھ کام ہونا چاہئے۔ جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ ایک صاحب نے کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ سن ہجری یا سال عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن ہیہات۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان و بیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، یا اب لوہے، فولاد، کیمیاوی کھاد تیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے لیکن ایک دن ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے کہا یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس خصوص میں بہت کام کیا ہے۔ میڈیکل سائنس میں ایسی دستگاہ تھی کہ ایک ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بدہضمی کی فوراً تشخیص کر دی کہ تم نے تربوز بہت کھایا ہے۔ محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر کہ مریض کے اِردگرد تربوز کے چھلکے بکھرے تھے۔ اسٹرانومی یعنی علم ہیئت میں اب بیشک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں کیونکہ ہم میدان میں نہیں ہیں۔ ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درسِ نظامیہ میں علمِ ہیئت بھی پڑھاتے تھے۔

ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بولے یہ علم ہیئت کپلر اور کوپرنیکس وغیرہ والا۔ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں۔ ہمارے حکماء نے ان سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگا لیا تھا۔ بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں، یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتارِ زمانہ پر اور لوگوں کی قسمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بیشمار تصانیف از قسم جنتریاں موجود ہیں بلکہ بعضے ادارے تو سال کے سال نئی جنتریاں چھاپتے ہیں۔ جس میں برجِ حمل، برجِ عقرب وغیرہ کے سعد و نحس کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیریں، فالنامے وغیرہ درج رہتے ہیں۔ جابجا زائچے بھی دیئے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اُن میں صابن سازی، اور بوٹ پالش بنانے اور پونڈ کریم اور قدرتی رنگ کا خضاب وغیرہ تیار کرنے کے نسخے بھی دیئے ہوتے ہیں جس سے اس گمان کی ایک حد تک تردید ہو جانی چاہئے کہ ہماری توجہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے۔ اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں سے پرانی وضع کے جو لوگ یورپ جاتے رہے ہیں بس جاتے تھے اور پھر پھرا کے خالی ہاتھ آجاتے تھے۔ ٹرانزسٹر، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کچھ ساتھ نہ لاتے تھے۔

اس کی توجیہہ تو کوئی کرنا چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ اور کچھ ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں تاویل کرنا خوب جانتے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بس کتابیں اور سفرنامے وغیرہ لکھتے تھے۔ سر سیّد احمد خان گئے۔ کچھ تو اسلام کا مقدمہ لڑتے رہے۔ میور کی کتاب کے جواب فراہم کرتے رہے۔ مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی بدگمانیاں دُور کرتے رہے اور واپس آئے تو سائنٹیفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈال ترجمے شروع کر دیئے۔ وہ تو اس زمانے کے مولوی ذرا مستعد تھے ان کی نیچریت اور کفر وغیرہ کو فوراً پکڑ لیا ورنہ سیّد صاحب جانے کہاں تک جاتے۔ شیخ عبدالقادر گئے تو اقبالؔ کو خط لکھ مارا کہ

[illegible]

اور ''مخزن'' میں ایک مضمون بھی لمباچوڑا لکھا کہ '' گھر سے نکل کے دیکھو۔۔ ہندوستان والو'' ہر پھر کے پھر ذکر مولوی محبوب عالم کا آتا ہے کہ اچھے خاصے پرانی وضع کے آدمی تھے۔ داڑھی تو بیشک یوروپ جا کر نہ منڈوائی اور گوشت کھانے میں بھی احتیاط کرتے رہے۔ فقط یہودیوں کی دکانوں سے قوشر (شروع شروع میں یورپی ممالک میں اسلامی طریقے سے ذبح کیا ہوا حلال گوشت نہیں ملتا تھا۔ البتہ یہودی طریقے سے ذبح کیا ہوا گوشت جسے قوشر کہا جاتا ہے مل جاتا تھا۔ مسلمان اسے اس لئے ترجیح دیتے تھے کہ ایک تو یہودی طریقہ ذبح اسلامی طریقہ ذبح سے تقریباً ملتا جلتا ہے اور دوسرے یہودی بھی مسلمانوں کی طرح سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ لیکن اب چونکہ صورتحال بدل چکی ہے اور یورپی ممالک میں بھی حلال گوشت دستیاب ہے اس لئے مسلمان اب قوشر کے بجائے اسلامی طریقے سے ذبح کیا ہوا حلال گوشت ہی کھاتے ہیں۔۔ ادارہ) یعنی حلال کھانے یا سبزیاں دالیں کھاتے رہے اور ہماری طرح ٹھنڈا پانی پیتے رہے لیکن ویسے مغرب کی ترقی سے ان کی آنکھیں چوندھیا گیئں۔ اپنے ۱۹۰۰ء کے سفرنامے میں برلن کے ٹیکنیکل ہائی اسکول کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بھی جا کر یہ اسکول دیکھا اگرچہ اب یہ یونیورسٹی بن گیا ہے لیکن عمارت وہی پرانی ہے جو مولوی محبوب عالم نے دیکھی تھی۔ ذرا اُن کا بیان سنیئے کیسے لٹو ہوئے ان لوگوں پر کہ ہمارے کلاسیکل طرز تعلیم تک کی بُرائی کر دی۔

''جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت اور عزت دی ہے وہ یہاں کا پالی ٹکنی گم یعنی ٹکنیکل ہائی اسکول ہے۔ یہ مدرسہ ایک سوایک سال سے جاری ہے۔ میں ساڑھے پانچ گھنٹے برابر اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا۔ آدھا بھی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل یورپ کے تین ہزار طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ سوائے ترکی کے یورپ کے ہر ملک کے طالب علم یہاں ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشین کا چھوٹا سا نمونہ طالب علموں کے سمجھانے کے لئے رکھا ہے لیکن ایک دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے ہر پرزہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصوں سے دکھائے گئے ہیں۔ عمارات اور پلوں کے ماڈل، دخانی جہازوں کے نمونے، نقشہ کشی، نجاری، علم رنگ کے لکچر کے کمرے اور خدا جانے اور کتنے کمرے اور لکچر روم۔ جرمنوں کو یہ کہنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ مسلمان بڑے ناز سے اب تک یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں ایک وقت میں دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض کے دارلعلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں، مگر بھلے آدمیوں دیکھو تو سہی وہ کیا پڑھتے ہیں اور یہ کیا پڑھتے ہیں۔ جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ہڈیاں ہو چکی ہیں۔ کوئی میندی پڑھنے والے کو ذرا امریکہ کی مشہور بک یونیورسٹی کی رصدگاہ میں یا گرینچ (انگلستان) کی رصدگاہ میں لے جا کر مقابلہ تو کرے کہ وہ فرضی علم ہیئت صحیح ہے یا یہ عینی مشاہدہ ستاروں کا عظیم الشان دوربینوں سے۔ جو لوگ اس قسم کے مقابلوں کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے معاف کریں۔

تو وطوبیٰ و ما و قامتِ یار

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ''

آگے چل کر مولوی محبوب عالم دردمندی سے لکھتے ہیں:۔

''اس ٹکنیکل اسکول کے معائنہ کے دوران میں اس کی عظمت اور سامان کو دیکھ کر مجھے اپنا آپ حقیر معلوم ہوتا تھا اور مایوسی ہمت کو ایسا پست کر رہی تھی کہ دل میں خیال گزرتا تھا کہ اس قسم کی زندگی کا تو خودکشی سے خاتمہ کر دینا چاہیئے جو ایسی ناکارہ ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ جس کے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم گاہ ابھی دو صدیوں تک قائم نہیں ہوگی۔''

سچ پوچھیئے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے کچھ دن پہلے تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچے مسلمان بننا چاہیئے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، اب ہمارا خیال ہے کہ سچے مسلمان بننے کے علاوہ بھی کچھ کرنا پڑے گا، قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہوگی، کارخانے بنانے ہوں گے،

اجتماعی فارموں میں ٹریکٹروں اور مشینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم ہو۔ سب اچھا کھائیں، پہنیں، ٹیلی ویژن جناب شیخ ہی کے گھر میں کیوں ہو مرید سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ جو آج پڑھ لکھ کر کلرک اور چپراسی کی نوکری کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں، کل مکینک اور خرادیے ہوں گے تو اپنی خودی کو بھی بلند کر سکیں گے۔ میرے آپ کے محتاج نہیں ہوں گے۔ جب آپ کے کھیت آباد، کارخانے رواں، خزانے بھرپور اور لوگ خوش باش ہوں گے پھر کیا مجال ہے جو کوئی ہمسایہ یا غیر ہمسایہ ٹیڑھی نظر سے آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت سچے مسلمان بننے کا مزہ بھی زیادہ ہوگا۔ اس وقت تو

شب جو عقدِ نماز بر بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

صاحبو! اوروں کی کیا کہیں۔ ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی۔ دوسروں کی شاعری پر واہ واہ اور مکرر ارشاد میں عمر گزار دی۔ کیا کریں ہماری تعلیم ہی سودا اور میر کے کلام سے شروع ہوئی۔ چھٹی جماعت کے اردو کورس میں میر تھے، خواجہ میر درد تھے، آتش تھے، سوز و گداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کہ ماسٹر گوردیال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیتے تھے جس سے کچھ تصور ایصال حرارت اور قوت انابیب شعری اور حیاتین وغیرہ کا اب تک ہے اور یہ معلوم ہے کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ مکتب میں پڑھے ہوتے تو۔۔۔ جھوم جھوم کر پڑھنا، شام کو روٹیاں مانگ کر لانا، چھوٹے چھوٹے مسلکوں پر لڑنا، مین میکھ نکالنا اور اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ فضا میں کیا ہو رہا ہے، خلا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم الکلام کے رموز تو استاد نے پڑھا دیئے جابر بن حیان کا نام نہ بتایا۔

جب کیپلر اور گلیلیو آسمان میں تھگلی لگا رہے تھے۔۔۔ ہم شاعری کر رہے تھے۔

جب واٹ اور اسٹیفن بھاپ کو غلام بنا رہے تھے۔۔۔ شاہ نصیر دہلوی کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بندھنے سے نہ رہ جائے۔

جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیووں کو اسیر کر رہے تھے۔۔۔ ہم شعری گلدستے فتنہ اور عطر فتنہ نکال رہے تھے۔

جب رائٹ برادران کلوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔ ہم اور رجب علی بیگ سرور لفظوں کے طوطے مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرع سے تاریخ نکال رہے تھے۔

اور جب امریکہ اور روس نے آسمان کے لئے نئے چاند ستارے بنالئے ہم پرانے اختر شناس اب بھی جنتریوں اور فالناموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہوٹلوں کے بالا خانے عطائی معالجوں، ہرڑ پوپوں سے آباد ہیں۔ عباسیوں کے عہد کو کتنی صدیاں ہوئیں۔ جاگو اور دیکھو کہ اب کس پادشاہ کی پادشاہی ہے، بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، قافیہ پیما، منشی احمد حسین قمر اور منشی محمد حسین جاہ تو ضرور ملیں گے، لیکن مسلمانوں میں کوئی کوپرنیکس، واٹ، ایڈیسن اور مارکونی نہ ملے گا۔ جس نے کی شاعری کی، مشاعرہ برپا کیا، گلدستہ سخن نکالا، یا پھر نئے فرقے پیدا کئے، مقلد و غیر مقلد کی بحثیں چلیں، آمین بالجہر پر فساد ہوئے، ذبیحے اور رویت ہلال پر آ کر سفینہ کنارے لگا۔

ایمسٹرڈم میں اور برلن میں ایسے ڈپارٹمنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں، لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیئر کیسے کام کرتے ہیں، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔۔۔ یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔

یارو! کیا ہیں یہ قصے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔۔۔ فارس کے شہزادوں کی کہانیاں ہیں، جان عالم اور بدر منیر کو کب تک روؤ گے، میر کی

سبزہ ناکہ کر گیا تہ... کہ تیل ہی مذکور تھا

کب تک ہماری نئی نسل کے کورسوں میں رہے گی۔ سکندر تو جب دنیا سے گیا تب خالی ہاتھ تھا، تم تو دنیا میں خالی ہاتھ ہو۔ غالب جیسے بھی ہستی کے فریب میں نہیں آئے عالم کو حلقہ دامِ خیال جانتے رہے اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اس شاعر کے دیوان میں ڈھونڈ لئے۔ جیسے آریہ سماجی لوگ جیٹ ہوائی جہازوں کو ویدوں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبو! دن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤ نوش کرنے والے، مجرا دیکھنے والے اور مشاعرے کرانے والے کچھ غدر کے ساتھ، کچھ پچھلی صدی کے ساتھ گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں فنا ہوئے کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تو ان کی ایک یاد سی باقی ہے، سو وہ بھی کیا ہے اچھا ہے یہ لوگ ختم ہوئے۔ اچھا ہے ہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوتے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کئے جب برطانوی راج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ آزادی کا تصور بھی نہ تھا ان کو دو سو سال تک کچھ ہوتا نظر نہ آیا۔ ہم اتنے مایوس نہیں۔ دست و بازو بھی مضبوط رکھتے ہیں۔ موقع ملے تو ذہن کی جودت میں بھی کم نہیں۔ اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز و گداز اور وحدت الوجود اور مراعاۃ النظیر اور رویت ہلال وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

(ابن انشا کے سفر نامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' سے لیے گئے ایک سفر کی روداد)

☆☆☆☆☆

افغانستان

(۱۹۶۶ء)

ایک سفرنامہ، جو کہیں کا بھی نہیں ہے

ہم نے سفرنامے بہت لکھے ہیں، چین وماچین کے سفرنامے، ایران توران کے سفرنامے، ان جگہوں کے سفرنامے جہاں ہم نہیں گئے اور ان وارداتوں کا چشم دید احوال جو ہم نے نہیں دیکھیں۔ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ٹانگیں بے شک دی ہیں لیکن دماغ بھی تو دیا ہے جس کی اہمیت ٹانگوں کے برابر نہ ہو۔ بہر حال ہے تو۔

آج کا سفرنامہ ہے تو سفرنامہ لیکن اگر کوئی پوچھے کہ کہاں کا ہے تو بتا بھی نہ سکیں۔ آج صبح ہم کابل کے لئے چلے تھے لیکن رات ہوگئی ہے اور کابل پہنچے نہیں ہیں۔ پہلے راولپنڈی میں لیٹ ہوئے۔ پھر پشاور سے چلنے میں تعویق ہوئی۔ آخر چلے۔ پائلٹ نے بتایا کہ آپ کے نیچے اس وقت درۂ خیبر ہے پھر کہا یہ داہنی طرف کی جلال آباد کا قصبہ ہے اور یہ ٹیڑھی میڑھی جوئے کم آب دریائے کابل کہلاتا ہے۔ اب آپ حکومت افغانستان کے وہ فارم بھر دیجئے جن میں وطنیت قومیت وغیرہ لکھنی ہوتی ہے اور اب صاحبان (پائلٹ نے کھنکار کر کہا) اب تھوڑی دیر میں ہم پشاور کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں کیونکہ کابل گھنگور بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہاں ہم اتر نہیں سکتے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔

دراصل آثار شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھے۔ جب سے کابل جانے کا سنا لوگ ہمیں برابر ڈرا رہے تھے کہ سردی ہے جانا نہیں۔ مرجاؤ گے۔ مولانا حامد علی خان نے کہا میں کابل میں دو دو اوورکوٹ پہن کر بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ تن زیب کا انگرکھا پہنے ہوئے ہوں۔ حمید اختر نے نصیحت کی کہ جاتے ہی وہاں سے دگلہ نما افغانی کوٹ خرید لینا (ورنہ میں نتائج کا ذمہ دار نہ ہوں گا) ان لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر طعنے تشنے پر اُتر آئے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے جو تم وہاں جا رہے ہو۔ خیر فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

ایک جونا مارکیٹ ہم شرما شرمی میں نہیں گئے، ورنہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ہم نے اپنے لئے کپڑے جمع نہیں کئے۔ ہمیں دراصل اوورکوٹ وغیرہ درکار تھے اور کوئی اونی زیر جامہ مل جاتا تو سبحان اللہ، لیکن ہماری شہرت ایسی خراب ہوئی کہ لوگوں نے قیاس کیا، ہم شاید فلسطین کے مہاجروں یا افغانستان کے پاوندوں کے لئے کپڑے جمع کر رہے ہیں۔ نتیجۃً سب نے اپنے پھٹے ہوئے گھسے ہوئے کپڑے ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر واپس سے گا تو ڈرائی کلین کرا کے دے گا، نہ دے گا تو ہماری جان ان کپڑوں سے چھوٹے گی۔۔۔۔ دونوں صورتوں میں نقصان اسی شخص کا ہے۔ اوورکوٹ ہمارے پاس دو ہوگئے ایک تو آغا جعفری کا عطیہ اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب کہ پہننے کو جی نہ چاہے، دوسرا حبیب اللہ شہاب کا جو شاید انھوں نے قطب شمالی کی مہم کے لئے بنوایا تھا کیونکہ ہم نے اسے پہنا تو بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ گئے، دو آدمیوں نے ہماری بانہوں میں ہاتھ دے کر ہمیں دوبارہ کھڑا کیا اور پھر اسے پہن کر ہم بالکل برفانی ریچھ معلوم ہوتے تھے۔ بس رنگ کا فرق تھا کیونکہ برفانی ریچھ غالباً سفید ہوتا ہے۔ کلہ و دستار ہم سر پر نہیں رکھتے لیکن اس خاص موقعہ کے لئے ایک فیلٹ خریدی اس کا الٹا سیدھا معلوم کیا۔

لومڑی کی کھال کے دستانے لئے۔ گلے میں کانگڑی ڈالنے کا بھی خیال تھا لیکن وہ کشمیر کی خاص چیز ہے، ہمارے کراچی میں نہیں ملتی۔

اس سارے سازوسامان سے لیس ہو کر دمِ تحریر ہم پشاور میں پڑے ہیں۔ یہ ڈین ہوٹل کا کمرہ ۴۷ ہے۔ آتشدان میں آگ دہک رہی ہے۔ جس طرح ہمارے گاؤں کے فتح دین درزی نے کراچی میں ایف. ڈین اینڈ سنز ٹیلرز اینڈ آؤٹ فٹرز کے نام سے اپنی دکان لگائی اور چمکائی ہے۔ اس سے ہم سمجھتے تھے کہ ڈین ہوٹل بھی کسی احمد دین یا نوردین کا ہوگا۔ لیکن ہوٹل کا ناک نقشہ بتاتا ہے کہ یہ واقعی کسی انگریز بہادر کی ملکیت رہا ہے۔ لان کشادہ، احاطہ کشادہ، کمرے کشادہ، ہر چیز کشادہ ہے سوائے مالکوں کے دل کے، کیونکہ ہمارے کمرے میں بجائے غالیچوں کے ان کی کترنیں پڑی ہیں۔ ٹھنڈے کمرے کے فرش پر ان پر پاؤں رکھتے ہوئے یوں گزرنا پڑتا ہے، جیسے کیچڑ میں پڑی ہوئی اینٹوں پر بچتے بچاتے قدم رکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ لاؤنج کے قالین بھی گھسے پھٹے ہیں اور عظمت رفتہ کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ جدید ہوٹلوں کی سی نہ اس میں شان ہے، نہ آسائش۔ اپنی عمر طبیعی میں سے یہ کچھ ہنس کر گزار چکا ہے اور کچھ رو کر گزار رہا ہے۔ سید محمد جعفری نے جو مصرع پرانے کوٹ کی مدح میں لکھا تھا۔ ہمیں اس ہوٹل کو دیکھ کر یاد آیا۔

؎ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

باوجود فون کرنے کے کوئی دوست پشاور میں نہ مل سکا لیکن پشاور والوں کی عالی حوصلگی سے ہم کماحقہ متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمیں پی آئی اے کے دفتر جانا تھا کسی نے بتایا کہ انٹرنیشنل ہوٹل میں ہے۔ ہم نے اپنے ہوٹل کے کونٹر پر جا کر پوچھا کہ کتنی دُور ہے یہ جگہ؟ تو کونٹر کلرک نے بتایا کہ جناب بالکل ہمارے پچھواڑے ہے۔ بس کوئی ایک فرلانگ ہوگی۔ آپ ہوٹل کے دروازے سے نکل کر بڑی سڑک پر آیئے اور بائیں ہاتھ کو چلیئے بس سامنے ہی ہے۔

جب ہم اس ہدایت کے مطابق کوئی پون میل کی مسافت طے کر چکے تو ایک صاحب سے پوچھا۔۔انھوں نے کہا: ''پی آئی اے کا دفتر؟'' اجی وہ تو یہ رہا۔ آپ کو اسی راستے پر ایک سینما ملے گا، اس کے بعد بس پی آئی اے کا دفتر ہے۔'' اور واقعی اس جگہ سے کوئی آدھ میل آگے ہمیں وہ دفتر مل گیا۔ یہ جگہ واقعی ڈین ہوٹل کے پچھواڑے میں ہے لیکن ایسا ہی ہے جیسے کراچی کے پچھواڑے میں کاٹھیاواڑ ہے اور لاہور کے پچھواڑے میں تبت پڑتا ہے۔ انسان عالی حوصلہ ہو تو اسے میل اور فرسنگ کے فاصلے فرلانگیں اور گز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا پشاور کی مزید سیر کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اس ایک مثال سے خائف ہو گئے کیونکہ ہم ان بزرگ سے پوچھتے کہ درّہ خیبر کتنی دور ہے تو وہ یقیناً یہی فرماتے کہ بس دو منٹ کا راستہ ہے۔ سیدھے اس سڑک پر چلے جایئے، اگلے چوک پر داہنے ہاتھ کو درہ خیبر ہی تو ہے۔

+++++

ہاں، کابل میں گدھے ہوتے ہیں

ہم اور رمضان شریف قبلہ کابل میں ایک ہی روز وارد ہوئے۔ پاکستان اس لحاظ سے افغانستان کے مقابلے میں پسماندہ ہے کہ یہاں ابھی ماہِ شعبان چل رہا تھا پشاور سے ڈین ہوٹل کی میزبانی کا لطف اٹھاتے اور چلغوزے ٹھونگتے ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے لیکن پون گھنٹے بعد کابل کے خوبصورت ہوائی اڈے پر اُترے تو پرچہ لگا کہ صاحبو، آج ہر طرف یکم رمضان کی تعطیل ہے۔ آپ کی باچھوں پر جو چلغوزوں کے چھلکے لگے ہیں

انھوں اچھی طرح صاف کر لیجئے۔

کابل میں ہم دو چیزوں کا رعب دل میں لے کر گئے تھے۔ ایک سردی کا، دوسرے رمضان شریف کا۔ سردی کے ڈر سے ہم نے جو پوستینوں، دہرے تہرے سوئٹروں، مفلروں، طرح طرح کی ٹوپیوں اور کنٹوپوں، دستانوں اور قطب شمالی والے اوورکوٹوں کا انتظام کیا تھا۔ جاڑے میاں شاید اس کا سن کر دبک گئے اور کابل والوں سے کہا کہ یہ شخص یہاں سے جائے گا تو پھر تم لوگوں سے سمجھوں گا۔ جتنے دن ہم کابل میں رہے، جاڑا بس ایسا ہی تھا جیسا پنڈی میں ہوتا ہے، پشاور میں تھا بلکہ لاہور میں بھی۔ کوئٹہ سے اک ذرا سردی کی لہر آ جائے تو ایسا نقشہ تو کراچی میں بھی ہو جاتا ہے۔ دستانے، سوئٹر، مفلر اور کنٹوپ اور حبیب اللہ شہاب والا مہا اوورکوٹ دیکھ دیکھ کر ہم اتنے دنوں جھلایا کیے۔ ایک روز بھی کڑاکے کی دنداں شکن سردی پڑ جاتی، تو ان کا مصرف نکل آتا اور ہمیں گلہ نہ رہتا۔

روزوں کے متعلق اپنے افغان اور پٹھان بھائیوں کے متشدد رویے کا ذکر بھی ہم سن چکے تھے۔ بیشک ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے وہ روشن خیال اور مغربی قسم کا تھا تاہم لوگوں نے بتا رکھا تھا کہ سنا ہے وہاں تڑکے ہی مسافروں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر اٹھا دیتے ہیں اور بنوک شمشیر روزہ رکھواتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ یہ اندیشے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ہم نے کابل کے ریستورانوں اور بھٹیار خانوں کو اسی طرح احترام کے پردے لٹکائے کاروبار کرتے دیکھا جیسا کراچی میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک آدھ بار روزہ رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ایک افغان دوست نے کہا کہ شوق سے رکھو۔ ہم منع نہیں کرتے لیکن اتنا دیکھ لو کہ تم سفر میں ہو اور سفر میں روزے کی احتیاط رکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے جذبہ ایمانی کو اتنی ڈھیل نہ دیتے تو ہماری روزہ کشائی کی خبر کابل سے آتی۔

کابل میں دو ہی اچھے ہوٹل ہیں۔ کابل اور سپین زر۔ سپین زر تو ابھی حال ہی میں بنا ہے اور الٹرا ماڈرن گنا جاتا ہے، اگرچہ زیادہ بڑا نہیں۔ کابل پرانا ہے، وضعدارانہ شریفانہ اور آرام دہ۔ باہر سے اس کی سہ منزلہ عمارت بے رنگ سی ہے لیکن اندر جائیے تو لاونج اور کمرے اور سازو سامان سب نفیس۔ ہم کابل ہوٹل میں اترے۔ کمرے کا بھاڑا ٹھہرایا۔ معلوم ہوا تین سو افغانی روزانہ دینے ہوں گے۔ دس فیصدی سروس اس پر مستزاد، ناشتہ اور کھانا اس کے علاوہ۔ کسی چیز کے دام ہم سینکڑوں میں سنیں تو ہمیں ہمیشہ اختلاج ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے سکون ہوا کہ ایک افغانی ہماری مرحومہ دوّنی کے برابر ہوتا ہے۔ ہم نے سو روپے پاکستانی دیئے اور ہوٹل والے نے آٹھ سو افغانی ہمیں گن دیئے۔ حساب سے چالیس پینتالیس روپے کا کمرہ پڑا۔ جسے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں کہہ سکتے لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر گلبرگ تو یہ دام سن کر اچھل ہی پڑے کیونکہ ڈالر کے حساب سے گنیں تو یہی افغانی ایک آنے کا پڑتا ہے اور تین سو افغانی کا مطلب ہو چار ڈالر روزانہ۔ بات یہ ہے کہ افغانستان میں سکے کی بین الاقوامی قیمت مقرر نہیں ہے۔ ہر روز بازار کا بھاؤ نکلتا ہے۔ ڈالر کے ستر پچھتر افغانی مل جاتے ہیں اور روپے کے بہت دوڑ دھوپ سے شاید نو افغانی مل جاتے ہیں۔ بہر حال ہم کسی چیز کے دام سن کر اسے فوراً پاکستانی سکے میں ڈھالتے تو وہ خاصی مہنگی معلوم ہوتی، گلبرگ صاحب کی آنکھیں ارزانی دیکھ کر چمک اٹھتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کابل جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے، کچھ بھی نہ لا سکے اور ڈاکٹر گلبرگ وہاں سے لدے پھندے گئے۔

پشاور کے ہوائی اڈے پر ہم نے اپنے ہم سفروں میں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ کو دیکھا کہ لمبی سُرخ داڑھی ہے اور سر پر بھی کنگھی سے بے نیاز بالوں کا جھاڑ کھڑا ہے۔ تھوڑا لنگڑاتے ہیں اور چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ پھولدار باسکٹ پہنے ہوئے تھے یعنی ان کی وضع قطع سج دھج سب سے الگ تھی۔ ہم پی آئی اے کے کونٹر پر اپنا ٹکٹ دکھا رہے تھے کہ وہ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پاس یہ SAS یعنی سکنڈے نیوین ایئر سروس کا ٹکٹ کہاں سے آ گیا۔ ہم نے بتایا کہ یونیسکو جس کی طرف سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، اس نے پیرس سے اس کا انتظام کیا تھا۔ بولے مجھے یوں جستجو ہوئی کہ میں ڈنمارک کا [illegible] SAS [illegible] وطن کی کمپنی ہے اسی پر بات چل نکلی۔ ہم نے انھیں بتایا کہ آپ کے

وطن کی زیارت بھی ہم کر چکے ہیں۔ کوپن ہیگن کے علاوہ السی نور بھی گئے تھے۔ جہاں ہملٹ کا قلعہ ہے اور جہاں سے سمندر پار سویڈن نظر آتا ہے۔

بولے مجھے افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر ڈنمارک میں گزارا کر السی نور آج تک نہیں دیکھا۔ ہم نے یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ ہم نے بھی کراچی میں آدھی عمر گزار دی ہے لیکن منگھو پیر نہیں گئے۔ زیادہ تفصیل میں ہم نہیں گئے تا کہ ہمارا منگھو پیر ان کے السی نور کے مقابلے کچا نہ پڑ جائے یہ ڈاکٹر گلبرگ تھے۔

ڈاکٹر گلبرگ دوا دارو والے ڈاکٹر ہیں لیکن نسخوں کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے ہیں اور یہی ہماری ان سے دوستی کی وجہ ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب ''اسکیمو ڈاکٹر'' برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کئی ملکوں میں چھپ چکی ہے، ہم نے ریڈرز ڈائجسٹ میں اس کا ذکر یا خلاصہ پڑھا تھا اور کچھ کچھ یاد تھا۔ یہ سن کر وہ اور خوش ہوئے اور اپنی بی بی سے کہا دیکھو یہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے اِس نے غیدغ ڈائجسٹ میں میری کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ فرانسیسیوں کی طرح ''ر'' کا تلفظ وہ ہمیشہ ''غ'' ہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر گلبرگ مہم جو آدمی ہیں۔ برسوں وہ گرین لینڈ جا کر اسکیموؤں کے ساتھ رہے۔ ان کی زبان اور معاشرت اختیار کی۔ انھی کا سا بے نمک کھانا کھاتے رہے۔ یہی مچھلی، ریچھ کا گوشت وغیرہ۔ برف کے جھونپڑوں میں قیام کیا اور پھر یہ کتاب لکھی اب میاں بی بی ایشیا اور مشرق بعید کے دورے پر نکلے تھے۔ کینیا، ہندوستان، تھائی لینڈ اور نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے، اب کابل اور تہران ہو کر وطن واپسی کا پروگرام تھا۔ ہندوستان سے یہ لوگ ایک شب ٹھہر کر بھاگے کیونکہ یہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جن پتھ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس روز سادھوؤں اور غیر سادھوؤں کی طرف سے گئو کشی کے معاملے پر وہ خوف ناک مظاہرہ ہوا تھا جس میں جان و مال کا بے حد نقصان ہوا۔ مظاہرین نے مغربی ٹورسٹوں کو بھی جہاں وہ نظر آئے گھیر لیا اور کہا یہ لوگ بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ خشمگیں مجمع کے نرغے سے نکل کر ہوٹل واپس پہنچے اور اسی دن نیپال روانہ ہو گئے۔

پاکستانیوں، خصوصاً پشاور والوں کے یہ بہت معترف تھے کہ بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں۔ پی آئی اے کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے کہ اس کے آدمی بہت خلیق اور متواضع ہیں ہاں اپنے پشاور والے ہوٹل کے نام سے بے مزہ ہوتے تھے۔ کہتے تھے یہ نظر بٹو ہے تا کہ پاکستان کو نظر نہ لگ جائے۔ دیکھو کابل ہوٹل میں یہ چار ڈالر روزانہ کا کتنا اچھا کمرہ ہے۔ اسے گرم رکھنے کا مرکزی نظام بھی ہے۔ قالین، فرنیچر، سروس بھی کچھ معقول۔ پشاور میں میں تین روز رہا اور اس باوا آدم کے زمانے کے کمرے کے تیرہ ڈالر روزانہ دیتا رہا۔ یہی نہیں ان لوگوں نے پانچ روپے روزانہ اس لکڑی کے بھی مجھ سے وصول کیے جو کمرہ گرم رکھنے یا اس میں دھواں پھیلانے کے لئے روزانہ جلانی پڑتی تھی۔

جاتے ہوئے جن لوگوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟ ان کی اطلاع کے لئے گزارش ہے کہ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مطلب چار ٹانگوں والی بلا سینگ کی مخلوق سے ہے۔ دو ٹانگوں والے بھی یقیناً ہوں گے ہم نے زیادہ جستجو نہیں کی۔ یہ گدھے وہ تھے جو زرنگار پارک کے سامنے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان کے پالان سنگتروں سے بھرے تھے۔ یہاں سنگترے تُل کر بکتے ہیں۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی سنگتروں پر مچل گئیں اور بولیں ان کا بھاؤ پوچھو۔ ہم نے بھاؤ پوچھا ''آغا چند است؟'' ایران کی طرح یہاں بھی یہ معلوم ہوا کہ فارسی بولنا آسان ہے سمجھنا مشکل۔ آغا نے جو جواب دیا۔ وہ ہمارے پلے نہ پڑا۔ حالانکہ ہم نے چہ؟ چہ؟ کر کے ایک دو بار وضاحت بھی چاہی۔ ان غیر ملکیوں کو یہ بتانا غیر ضروری تھا کہ یہ گدھے والا ان الفاظ میں ادائے مطلب سے قاصر ہے جو ہماری سمجھ میں آسکیں لہٰذا ہم نے کہا، چھوڑیئے، بہت مہنگا دیتا ہے۔ لیکن وہ خاتون تھوڑی دور ایک اور گدھے کے پاس مچل گیئں کہ یہاں سے لے لو۔ یہ سستا دے گا۔ ہم نے ایک باٹ کی طرف اشارہ کر کے سنگتروں والے سے کہا کہ آغا اس ایک باٹ کے تول کر دو۔ قیمت ہم نے نہ پوچھی کہ افہام و

تفہیم میں دقت نہ ہو۔ آخر باہم زبان سمجھنے نہ سمجھنے کا معاملہ ہمارا اور ہمارے افغان بھائیوں کا ہے۔ ڈنمارک والوں کو اس سے کیا مطلب۔ ہم نے دس افغانی کا نوٹ دے۔ اس نے چار افغانی کاٹ کر باقی ریزگاری ہمیں دے دی۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس دیارِ غیر میں جہاں ہماری زبان اور انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں۔ تم ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے موزوں الفاظ میں کسرِ نفسی کرنے کے بعد کہا کہ خیر انسان انسان کے کام آتا ہی ہے۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ وغیرہ

+++++

ریلوے........کونسی ریلوے؟

جس کام سے ہم کابل گئے تھے اس کا تعلق کتابوں سے تھا۔ ہم نے اپنے ایک افغانی دوست سے کہا کہ ہمیں کسی پبلشر سے ملوایئے۔

بولے: ''یہاں کوئی پبلشر ہی نہیں''

''چھوٹا موٹا تو ہوگا؟''

''نہ چھوٹا، نہ موٹا''

''پھر کتب فروش کتابیں کہاں سے لیتے ہیں؟''

''کتب فروش؟ کونسے کتب فروش؟''

ہم نے کہا ''بازار میں کتابیں بیچنے والوں سے مطلب ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشنوں پر بھی بک اسٹال ہوتے ہیں۔ کابل قندھار وغیرہ میں ہوں گے ہی، جہاں سے مسافر سفر میں دل بہلانے کے لئے ناول رسالے، جنتریاں وغیرہ خریدتے ہیں۔''

ہمارے دوست نے کسی قدر جھلاہٹ سے کہا

''میاں ہوش کی دوا کرو۔ کونسے ریلوے اسٹیشن اور کیسی ریلوے۔ تمہیں معلوم ہے افغانستان میں ریلوے نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ شیطانی چرخہ تمہی کو مبارک ہو۔''

تب ہمیں افغانستان کے متعلق وہ مضمون یاد آیا جو ہم نے کابل جانے سے پہلے پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ ''اِدھر آپ نے درہ خیبر کے پار، افغانستان کی نئی سرزمین میں قدم رکھا، اُدھر ایک صدی پیچھے پہنچ گئے۔''

لیکن کبھی کبھی مسافر کے ساتھ ابوالحسن سوتے جاگتے کا قصہ بھی ہو جاتا ہے اگر آپ پرانے شہر کے محلّہ شور بازار میں کسی کی آنکھیں بند کیجئے اور کابل یونیورسٹی لائبریری میں جا کر کھولئے تو گرم سرد یا شادی مرگ قسم کی واردات ہونے کا خطرہ ہے۔ ہماری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسی الٹرا ماڈرن لائبریری جدید ترین ساز و سامان سے لیس ہم نے اپنے ملک میں تو دیکھی نہیں اور بھی کم ہی ملکوں میں ہو گی۔ نقشہ اس کا امریکہ کی دعوت پر ایک جاپانی ماہر تعمیرات نے بنایا اور باقی ہر چیز میزیں، کرسیاں، الماریاں حتیٰ کہ کیل قبضے تک امریکہ سے آئے۔ کتابوں میں بھی امریکہ کا مال بھرا دیکھا۔ اگرچہ چند الماریاں روسی کتابوں کی بھی دکھائی دیں۔

پبلشروں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ افغانستان میں اس نام کی کوئی مخلوق نہیں۔ حکومت کے محکمے اور ادارے سرکاری مطبعوں میں کتابیں

چھاپتے ہیں۔ ان کی بھی مکمل تعداد پورے ملک میں پانچ ہے۔ پرائیویٹ پریس کوئی نہیں ہے۔ اوّل تو ان حالات میں کوئی شخص کچھ لکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا اگر کوئی مرزا غالبؔ یا فیض احمد فیضؔ پیدا ہو بھی جائے تو ازراہِ قانون اسے حکومت کو عرضی دینی چاہیئے کہ بندے کی یہ تالیفِ لطیف زیورِ طبع سے آراستہ کی جائے۔ وہ ٹھوک بجا کر (کسی کام میں جلدی نہیں کی جاتی) دیکھیں گے کہ ہاں کوئی مضائقہ نہیں تو حکم ملے گا کہ اچھا چھاپ دیتے ہیں۔ کاغذ کتابت طباعت کے پیسے لاؤ اور جب چھپ جائے تو جہاں جی چاہے، جیسے جی چاہے بیچو۔

مانگ کا حال یہ ہے کہ کچھ کتابیں شائقین خرید لے جاتے ہیں، کچھ بنیا لے جاتا ہے اور اس میں کشمش، چلغوزے وغیرہ ڈال کر بیچتا ہے۔ ہمارے انہی دوست نے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی کہو۔ اس نظام میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ بیہودہ شاعری اور رنگیلے ناولوں وغیرہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

ریلوے کی کہانی یہ معلوم ہوئی کہ شاہ امان اللہ خان نے اپنے زمانے میں دارالامان نام کی تازہ بستی بسائی تھی وہاں تک ریلوے لائن...... ریلوے نہ کہیئے ٹرالی لائن بچھائی تھی۔ بچہ سقہ نے ان کا تاج وتخت چھینا تو پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرنگیوں کی بدعت قرار دے کر اکھاڑ پھینکا۔ ہم نے دارالامان میں اس کے اکھڑے ہوئے زنگ خوردہ سلیپر اور دو تین ٹوٹی پھوٹی بوگیاں آثار صنادید کے طور پر ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑی پائیں جو ایک زمانے میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس وقت بھی ریلوے لائن کا فوری طور پر کوئی منصوبہ نہیں کیونکہ سڑکوں کے ذریعے آمدورفت کو بہتر بنانا آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی۔ دوسرے ممالک اس میں بڑی مدد دے رہے ہیں۔ کچھ سڑکیں روس نے بنائیں اور کچھ ان کی ضد میں آ کر امریکہ نے بنادیں۔ روس نے کوہ ہندوکش میں دو میل لمبی سرنگ لگا کر یا کھود کر یا بنا کر افغانستان میں تجارتی مال کی نقل وحرکت میں غیر معمولی آسانی پیدا کر دی ہے۔ بڑی طاقتوں کے دلوں میں افغانستان کا درد ایسا جاگا ہے یا پھر اسے کچھ اور نام دے دیجئے کہ روس اور امریکہ کے علاوہ جو امداد دینے کے معاملے میں اوّل اور دوم ہیں۔ مغربی جرمنی، فرانس اور برطانیہ بھی دامے درمے، قدمے سخنے افغانستان کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔ برطانیہ جو امداد دینے میں پانچویں نمبر پر ہے۔ دو کارخانے شکر کے اور ایک کارخانہ سرسوں کا تیل نکالنے کا قائم کر رہا ہے، کیوں نہ کرے، اس نے کڑوا پھیکا ہو کر دیکھ لیا، جنگیں بھی لڑیں، لیکن کچھ فائدہ نہ ہو۔ جب دیکھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں یعنی افغانستان والے سلطنت انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں آنے سے انکاری ہیں تو سرسوں کا تیل نکالنے کے کارخانے کی پیش کش کر دی اور کڑوے کسیلے پن کی تلافی کے لئے دو فیکٹریاں شکر کی بھی لا ڈالیں۔

کتب فروشوں کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سرے سے ناپید ہیں۔ ہم نے شہر نو کے علاقے میں دو تین کیبن نما دکانیں دیکھیں جن میں پرائمری اور مڈل کلاسوں کے لئے حکومت کی شائع کردہ چند درسی کتابوں کے علاوہ کچھ ایران کی پیپر بیک کتابیں کچھ امریکہ کے سستے ایڈیشن اور شمع دہلی کے پرچے نظر آئے۔ ایک دو جگہ فٹ پاتھوں پر پرانے امریکی ناول اور رسالے دکھائی دیئے جو کابل میں رہنے والے کسی گورے نے ردی میں بیچے ہوں گے۔ پھر دریائے کابل کی دیواروں کی منڈیر پر بھی لوگوں کو دس دس بیس بیس کتابیں رکھے بیچتے دیکھا، ان میں بھی زیادہ تر الف بے کا قاعدہ اور حساب وغیرہ کی درسی کتابیں تھیں۔ ہاں ایک دکان وزارتِ تعلیم کے دفتر کے نیچے ضرور سرکار نے حال ہی میں کھولی ہے۔ جس میں فارسی کے علاوہ کچھ روسی اور انگریزی کتابیں بھی دکھائی دیں یا پھر ایک دکان فرینکلن والوں نے باجازت سرکار قائم کی ہے اس میں زیادہ تر درسی مواد ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملک میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہیں۔ پہلا مدرسہ پہلی جنگ عظیم کے لگ بھگ امیر حبیب اللہ نے قائم کیا۔ جس کا نام تو حبیبیہ کالج تھا۔ لیکن مولوی محمد علی قصوری وغیرہ نے جو وہاں پڑھاتے رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ اس کی حیثیت مڈل اسکول سے زیادہ نہ تھی۔ نصاب نہایت ناقص۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ نصاب میں شامل کرنا چاہا تو مفتی شہر نے سخت اعتراض کیا کہ طالب علم وہابی ہو جائیں گے۔ اور آخر دم تک مخالفت [illegible] علامہ اقبال مرحوم اور سر راس مسعود کابل گئے تو

ان کو مدرسے دیکھنے کا بھی شوق ہوا۔ سخت مایوس ہوئے۔ ایک ملّا دوراز کار اور غلط کتاب پڑھا رہا تھا اور غلط مسئلے بیان کر رہا تھا۔ مولوی صاحب چپکے سے سٹک آئے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور بعد بے شمار پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان ان مکاتب میں جا کر پڑھاتے رہے ہیں۔ کیونکہ افغانی ٹیچر کہیں نہیں ملتے تھے۔ بعضے جان سے بھی گئے۔ مغربی طرز کے مدرسے میں فرانسیسی اور جرمن مدرس بھی تھے۔ مگر بہت سے افغان نوجوان یورپ کے مختلف ملکوں سے بھی تعلیم حاصل کر کے آئے۔ اب افغانستان میں دو طرح کے آدمی ملتے ہیں یا تو بالکل ان پڑھ یا کولمبیا یونیورسٹی کے گریجویٹ۔ خواندگی کا تناسب پانچ فیصدی کے قریب ہے اور اسکول اب بھی بہت کم ہیں۔ اتنا ہے کہ تعلیم نیچے سے اُوپر تک یعنی یونیورسٹی تک بالکل مفت ہے حتیٰ کہ کتابوں کا خرچ بھی سرکار دیتی ہے۔

دریائے کابل جو شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے ہمارے ہوٹل سے کچھ دور نہ تھا۔ دریا لفظ کے استعمال کے لئے ہم دریائے ستلج اور سندھ، دریائے گنگا اور جمنا، دریائے ہوانگ ہو اور نیکسی وغیرہ سے تہ دل سے معذرت خواہ ہیں.......کراچی والے دریائے کابل کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہئیں تو اس گندے نالے کو دیکھ لیں جو نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے لیکن وومن کالج کے پاس سے گزرتا ہے۔ فرق اس نالے اور دریائے کابل میں یہ ہے کہ اس نالے کا پانی نسبتاً صاف ہے اور اس میں سے اتنی زیادہ بُو نہیں آتی، پانی کی مقدار بھی آج کل تو اسی نالے میں زیادہ ہے۔ ہاں گرمیوں میں سُنا ہے برف پگھلتی ہے تو دریائے کابل کی ناطاقتی کچھ دور ہو جاتی ہے۔ دیوار پر سے نیچے جھانکیں تو دریا کی غریب نوازی کا نقشہ یہ نظر آتا ہے کہ یہاں ایک بڑھیا کپڑے دھو رہی ہے۔ دس قدم پرے اس میں سے چلو بھر کر کوئی آبدست بھی کر رہا ہے۔ تھوڑا آگے اس میں بچے نہا بھی رہے ہیں اور آس پاس کے گھر والوں کو بھی کوڑا پھینکنے کا بڑا آرام ہے۔ ٹوکری اٹھائی اور دریا میں جھاڑ دی۔ یہی دریا پیاسوں کی تشنگی بھی رفع کرتا ہے کیونکہ نئے حصّہ شہر کو چھوڑ کر پرانے شہر میں گھروں تک پانی کے پائپ لے جانے کا کوئی سلسلہ نہیں۔ ہتھی والے اور کہیں کہیں دوسرے نلکے البتہ ہیں جن سے محلے والے اپنی باری سے مٹی کے مٹکے اور جھجھریں بھر لے جاتے ہیں۔ ان مٹکوں کی وضع قطع کے ظرف ہم نے یا تو عجائب گھروں میں دیکھے یا پھر رباعیات عمر خیام کی بعض تصویروں میں۔ صراحی آپ نے دیکھی ہے؟ ان سے ذرا بڑے ہوتے ہیں لہٰذا انھیں صراحا کہہ لیجئے۔ ایک طرف کو پکڑنے کے لئے دستہ بھی لگا دیجئے۔ بیشک اب حکومت پانی پائپوں کے ذریعے گھروں تک پہنچانے کا بندوبست کر رہی ہے لیکن فی الحال تو شہر میں سقّوں کا راج ہے۔ ایک سقہ تو کچھ دنوں تک ملک کا بادشاہ بھی رہا ہے لیکن وہ الگ کہانی ہے۔

+++++

ست سری اکال

افغانستان سے آ کر کشمش میوے، سلاجیت اور ہینگ بیچنے والے آغا ہوتے تو دکاندار ہی ہیں لیکن ڈیل کارنیگی کی کتابیں ذرا کم پڑھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کاروبار کرتے وقت بھی اپنی خودی کو بلند رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کابلی آغا نے ہمارے ایک میر صاحب کو کاندھے سے جھٹک کر کہا، ''خو، ہینگ خرید و ہینگ۔'' میر صاحب لکھنؤ کے تھے۔ نہایت شائستگی سے بولے۔ ''قبلہ آغا صاحب! اس ہیچمداں کو ہینگ درکار نہیں۔'' آغا موصوف نے لال پیلے ہو کر ایک جھٹکا اور دیا اور فرمایا ''خو۔۔۔ کافر کا بچہ۔۔۔ کیسے نہیں خریدے گا۔ ہم کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہے جو اتنی دُور سے اُٹھا کے لایا ہے۔ نکالو پیسے۔''

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

ایک شاعر نے اس مضمون کو شعر میں بھی باندھا ہے

واسطے تیرے بچہ کافر

ہینگ غزنی سے جا کے لایا ہے

کابل کے بازاروں میں خریدنے والا بھی آغا ہوتا ہے، بیچنے والا بھی۔ البتہ آغا کی دکانداری کی دوڑ پھل، میوے، پرانے کوٹوں اور غالیچوں تک ہے۔ کبابی اور نانبائی، موچی اور دھنیا بھی بے شک افغان ہی ہے لیکن ہم جو ہوٹل سے نکل کر بازار کی طرف آئے اور کپڑے کی دوکان میں جھانکا تو دو سردار جی بیٹھے نظر آئے۔ ہانک لگائی۔ ''آؤ میاں جی کی چاہیدا اے'' جلدی سے آگے بڑھے تو دوسری دکان میں بھی سکھ، تیسری میں بھی، چوک زرنگار سے مسجد پل خشتی تک۔ مسجد پل خشتی سے جادۂ میوند کے دورویہ اور ادھر پارک کی طرف آتے ہیں اس چوک تک جس کا نام ہم لینا نہیں چاہتے (آپ سے کیا پردہ، اس کا نام چوک پختونستان ہے)۔ دورویہ خالصہ دربار کا نقشہ دیکھا، بڑی سڑک سے ہٹ کر ہم گلیوں میں گھس گئے۔۔۔ وہاں بھی سردار جی شدھ فارسی بولتے نظر آئے۔ ہم نے ساری عمر میں اتنے سکھ نہیں دیکھے جتنے اب کے کابل میں دیکھ لئے۔ سکھ ایران میں بھی ہیں۔ تہران میں ہم نے ان کی دکانیں دیکھیں اور زاہدان کی تو وجہ تسمیہ ہی سکھ ہیں۔ یہ لوگ کوئٹہ اور زاہدان ریلوے وغیرہ کی ٹھیکیداری اور مزدوری کے سلسلے میں ادھر گئے تھے، پھر وہیں رس بس گئے۔ اس بستی کا نام پہلے دُزدآب تھا۔ سادہ لوح ایرانیوں کو یہ بڑی بڑی داڑھیوں والوں کی ریل پیل نظر آئی۔۔۔ تو انھوں نے اِن کو خاصانِ خدا اور زاہدان شبِ بیدار کی صف میں شمار کر کے پوری بستی کو زاہدان کہنا شروع کر دیا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہم کابل ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے تھے کہ ایک بزرگ سفید ریش دو تین خالصہ حضرات کے جلو میں آہستہ قدم اٹھاتے وارد ہوئے۔ ہم نے غور سے دیکھا اور ان کو پہچاننے کی کوشش کی۔ آخر جب وہ ہمارے سامنے کی میز پر آن کر بیٹھ گئے اور ہمارے ایک پاکستانی صحافی دوست (م۔ش) نے لپک کر ان سے علیک سلیک یعنی ست سری اکال وغیرہ کی۔ تب ہم پر کھلا کہ ماسٹر تارا سنگھ جی ہیں۔ ہم نے بھی ان سے دعا سلام کی اور خیر خیریت پوچھی لیکن حیران تھے کہ یہ یہاں کہاں۔ ان کے ساتھ جو سردار جی تھے ان سے پوچھا، کہ ماسٹر جی کا ارادہ کدھر کا ہے۔ وہ گول کر گئے کہ پتہ نہیں۔ اصل میں وہ ہمیں ہندوستانی سمجھے۔ جب ہم نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں تو بولے۔ پھر ٹھیک ہے۔ بات یہ ہے کہ ماسٹر جی بالکل چپ چپاتے آئے ہیں۔ کسی کو خبر نہیں دی۔ اسی میں مصلحت ہے۔

ماسٹر جی آکر بیٹھے ہی تھے کہ سکھوں کا تانتا بندھ گیا۔ کابل کے سکھ شلوار پہنتے ہیں اور اکثر کھیس کی بکل مارتے ہیں۔ ان کی پگڑیاں بھی ڈھیلے ڈھالے پگڑ ہوتے ہیں بلکہ انھیں منڈاسا کہنا چاہئے۔ وہ جو نئی نسل کے سکھ ٹیڈی کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ منڈاسے ان کے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے کابل ہوٹل کا وسیع لاؤنج دربار صاحب امرتسر بن گیا۔ ہم کسی سکھ سے یوں بھی بات کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ سے کہا کہ سردار جی آپ لوگ کب سے یہاں ہیں۔ بولے کئی پشتوں سے ہیں بلکہ صدیوں سے۔ ایک نے ان میں سے آگے بڑھ کر کہا جی ہم پٹھان ہیں۔ ہم نے کہا آپ لوگ پشتہا پشت یہاں رہ کر بھی اتنی فصیح اور بامحاورہ اور دریائے بیاس میں دُھلی ہوئی پنجابی کیسے بولتے ہیں۔ بولے: واہ جی! یہ ہماری مادری زبان جو ٹھہری۔ ہمارے بچے گھروں میں پنجابی ہی تو بولتے ہیں۔ فارسی اور پشتو تو بڑے ہو کر دکانداری کے لئے سیکھتے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کی تعداد کیا ہوگی؟ ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے بولے: ''واہگرو جی کی کرپا سے کوئی دس ہزار جی ہون گے۔''

معلوم ہو کہ دس بارہ گوردوارے بھی ہیں۔ جلال آباد میں بھی ان کی آبادی بہت ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگا۔ کابل میں ہندو بھی ہیں۔ لیکن سکھوں سے کم۔ ایک آدھ جگہ کسی جوتشی کی دکان نظر آئی۔

کابل ایشیا میں ہے۔اس لئے بھاؤ تاؤ یہاں بھی خریداری کا لازمی جزو ہے۔ ایک آدھ جگہ ہم نے خریداری میں ڈاکٹر گلبرگ اور اُن کی بی بی کی رہنمائی کی، اور ترجمانی کی۔ دکاندار نے ہمیشہ یہی کہا کہ تمہارے دوست ہیں لہٰذا ہم ان کو مال بارعایت دیتے ہیں۔ بے شک وہ کم کر بھی دیتے تھے۔ چیزوں کا حال ہم لکھ چکے کہ سستی ہیں لیکن ٹورسٹوں والی چوٹ یہ لوگ ایک روز کھا ہی گئے۔ ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تھے کہ میاں بیوی جوش سے تمتماتے آئے اور کہا دیکھو ہم کیسی نادر چیزیں لائے ہیں۔ بس قسمت سے مل گئیں۔ ہم نے کہا دکھاؤ تو۔۔۔تب ان کی بی بی نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دو ٹوٹے ہوئے تانبے کے بادیئے نکالے۔ کہا دیکھو کتنی قیمت کے ہوں گے۔ ہم نے پوچھا آپ لوگوں نے کتنی قیمت دی۔ معلوم ہوا اٹھارہ ڈالر نقد۔ ہم چپ ہو رہے، لیکن وہ برابر داد حاصل کرنے پر مصر تھے بولے ''تم ان کی قیمت بتاؤ۔ یہ دیکھو اس پر یہ پرانی فارسی تحریر بھی ہے۔ اس کا ترجمہ بھی ہمیں مطلوب ہے۔'' ہم نے کہا بہرحال آپ لوگوں نے اسے نشانی کے طور پر خریدا ہے۔ اب اس کی قیمت سے کیا مطلب۔ اسے جا کر اپنے گھر میں سجایئے۔ بہت معمولی بادیئے تھے۔ دو ڈھائی روپے ان کی قیمت اس وقت ہو گی جب بالکل نئے تھے۔ ہندوستان کا بنا ہوا مال تھا۔ نہایت بھدّے لفظوں میں ایک پر لکھا تھا

''جناب پیالہ حاضر ہے''

دوسرے پر بھی ذرا مختلف عبارت تھی ''جناب جام حاضر ہے۔ مراد آباد''

جب ہم نے بتایا کہ ہمارے نزدیک ان کی قیمت کیا ہو گی اور یہ کہ عبارت اُردو میں ہے اور شہر کا نام بھی ہے' مراد آباد، جو ہندوستان میں واقع ہے تو بچاروں کے چہرے لٹک گئے۔ بولے، ہمیں تو خاص افغانی چیز کہہ کر دیا تھا۔ ہمارے ساتھ چلو واپس کریں۔ ہم گئے۔ خاصی دور دکان تھی لیکن افسوس وہ دن جمعرات کا دن تھا۔ دکان بند ہو گئی تھی اور ہفتے کے روز کھلنی تھی۔ ادھر ان بچاروں کا جہاز جمعے کی صبح جاتا تھا۔ اٹھارہ آنے کے پیالے کے اٹھارہ ڈالر دیئے۔ اگلی پچھلی کفایت کی سب کسر نکل گئی۔ ہم نے دلاسا دیا کہ خیر سردار گلبرگ سنگھ جی، ڈنمارک میں کسے معلوم ہو گا کہ اُردو ہے یا فارسی ہے اور مراد آباد افغانستان میں ہے یا بھارت میں۔

ٹورسٹوں کے ساتھ دوسرے ملکوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔ مشہور بات ہے کہ دلی میں کسی دکاندار نے ایک امریکن کے ہاتھ ایک کھوپڑی بیچی تھی کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہے۔ اس نے پچاس ڈالر میں خوشی خوشی لے لی۔ چند روز بعد وہ امریکن پھر اس دکان پر گیا تو دکاندار نے پھر ایک اور نسبتاً چھوٹی کھوپڑی اسے تھما دی اور اُسے بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ سے منسوب کیا۔ امریکن بہت جھلایا کہ رنجیت سنگھ کی کھوپڑی تو میں ابھی پرسوں پرلے روز لے کر گیا ہوں۔ دکاندار نے مسکرا کر کہا

''جناب یہ اُن کے بچپن کے دِنوں کی ہے۔''

+++++

آغا گپ بزنید

۱۹۶۴ء میں ایرانی فارسی ہماری رطب اللسانی کی گرفت میں آئی ہی تھی کہ ہمیں تہران سے لوٹنا پڑا۔ کابل جانے سے پہلے ہم نے کراچی میں اس تیغِ اصیل کو صیقل کیا اور افغانستان پہنچتے ہی کابلی آغاؤں پر اس کے وار کرنے شروع کیے۔ لیکن افسوس ہمارے سارے محاورے اور روز

مرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہم جس ملک میں جاتے ہیں وہاں سے گڑیا یا گڑیائیں ضرور لاتے ہیں۔ تہران میں ایک دکان پر ہم نے اپنی کتابی فارسی میں پوچھا کہ

''آغا لعبت می خواہم''

دکاندار نے جواب دیا

''لعبت؟ لعبت چہ؟'' یعنی لعبت کیا شے ہوتی ہے؟

ہم نے گڑیا کی طرف اشارہ کیا تو بولا ''اخاہ۔ عروسک می خواہی۔ ایں است'' مطلب یہ کہ سیدھے سیدھے عروسک کیوں نہیں کہتے۔

ہم نے عروسک کے لفظ کو پلے باندھ رکھا تھا۔ کابل میں ایک جنرل اسٹور پر جو تمبا کو، کپڑا، میوے، بائیسکل، گڑ اور ریزر بلیڈ بیچتا تھا۔ ہم نے اپنی حاجت بیان کی کہ آغا ''عروسکے می خواہم''

بولا ''عروسک؟ چہ عروسک؟'' یعنی وہ کس کھیت کی مولی ہوتی ہے۔ مثالیں دے کر واضح کرو۔

ہم نے انگلی سے اشارہ کیا تو بولا ''ایں گڈی است''۔ یعنی اسے گڈی کہتے ہیں۔ ایک جگہ ہمیں ایک ٹوکری پسند آئی۔ ٹوکری کے لئے ہماری گرہ میں فقط سبدِ گل کا لفظ تھا لیکن وہ ہمیں کچھ زیادہ ہی شاعرانہ نظر آیا۔ بس ہم نے اسٹور والے سے کہا۔

''آغا! ایں چیست؟''

بولا ''ایں ٹوکری است''

لہٰذا بعد ازاں اگر کوئی شخص کہتا ''ایں سرک خیلے خراب است'' تو ہم جان جاتے کہ اشارہ سڑک کی طرف ہے۔ ''من بہ دانہ مندی می روم'' مندی کا مطلب منڈی ہے۔ دردمندی وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم ہوٹل میں ''صبحانہ'' مانگتے رہے۔ کسی نے نہ دیا۔ آخر سیدھے سیدھے ناشتہ کہا تو بیرا فوراً باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ بوٹ پالش کرانے کے لئے ہم نے بہتیرا کہا کہ ''آغا واکس بزنید'' لیکن کسی نے تعمیلِ حکم نہ کی۔ آخر ہم نے کہا ''بوت پالش می خواہم'' تو فوراً پالش اور برش بھی نکل آئے اور کرنے والے کے دانت بھی۔ کابل سے واپس آنے کے بعد ہم جو اس قسم کے اشتہارات دیکھتے ہیں کہ ''مٹی کے یک صد چھکڑا جات برائے بھروائی گڑھا جات سڑک ہائے ضلع شیخوپورہ مطلوب ہیں'' تو ہمیں مطلق ہنسی نہیں آتی۔ نہ ہمیں برماشیل کے رسالہ ''پیام تیل'' کا نام عجیب لگتا ہے کیونکہ ہم نے اپنے ایک میزبان کو یہ کہتے سنا کہ ''ایں موتر خیلے تیل می خورد'' یعنی یہ موٹر بہت تیل کھاتی ہے۔

کابلیوں کو اپنی زبان پر فخر ہے اسے وہ انگریزی میں بھی کبھی پرشین نہیں لکھتے FARS ہی لکھتے ہیں اور اس کا رشتہ دری سے ملاتے ہیں جبکہ ایرانی فارسی کا رشتہ پہلوی سے ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فارسی کے اساتذہ کا کلام فارسی کے روزمرّے میں ہے اور افغانستان نے فردوسی اور سنائی پیدا کئے ہیں۔ ہرات، غزنی اور بلخ جو ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے مراکز رہے ہیں، افغانستان ہی میں تو ہیں۔

ایک آدھ بار ہمیں مقامی محاورے نے برا ماننے کا بھی موقع دیا۔ ایک محفل میں ایک نہایت سنجیدہ مسئلے پر ہم نے اظہارِ خیال کی اجازت چاہی تو صاحب صدر بولے:

''بلے بلے۔ گپ بزنید''..... یعنی ''ہاں ہاں۔ گپ مارو'' ہم بہت جز بز ہوئے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا مطلب ''ارشاد فرمایئے'' بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی پہلو توہین یا استخفاف کا نہیں ہے۔ اگر کوئی واعظ نغز گو و خوش گفتار بھی سرِ منبر دریائے فصاحت کی جولانی دکھائے گا اور رشد و ہدایت کے موتی لٹائے گا تو لوگ ازراہِ تحسین یہی کہیں گے کہ ''خوب گپ می زند'' مطلب اس کا صرف یہ ہوگا کہ اچھی باتیں کرتا ہے۔

جاتے ہوئے گھر والوں نے بہت تاکید کی تھی کہ کابل پہنچتے ہی اپنی خیریت کی اطلاع ضرور واپسی ڈاک سے بھیجنا۔ لہٰذا ہم نے

جاتے ہی کاغذ، لفافے اور ٹکٹ تلاش کرنے شروع کیے۔ ہمارے پاس کابل کا نقشہ ضرور تھا لیکن اس میں جہاں ڈاک خانہ لکھا ہوتا۔ وہاں تلاش کرنے پر یا تو سبزی کی دکان ملتی یا تنور۔ گلبرگ صاحب اور ان کی بی بی نے بڑے شوق سے کابل کی تصویریں اور اونٹوں کی قطاروں اور کھجوروں والے تہنیتی کارڈ جمع کیے تھے۔ وہ بھی ٹکٹوں اور ڈاک خانے کی تلاش میں سارا شہر گھوم گئے۔ دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا اور اپنے بچوں کے لئے یہ تحفے وہ دستی لے گئے۔ یہ بات نہیں کہ وہاں ڈاک خانہ ہے نہیں۔ نہ ہوتا تو وہاں سے خط کیسے آتے۔ ہمارے پاس تلاش کے لئے زیادہ وقت نہ تھا۔ ایک ہفتہ ہی تو تھا۔

ٹکٹ نہیں ملا نہ سہی۔ کاغذ لفافے ہمیں مل گئے تھے اور اس کے لئے ہمیں قصاب کی دکان پر نہ جانا پڑا۔ ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ جب ہم پہلی جنگ عظیم کے اواخر میں افغانستان گئے (ذکر شہر جلال آباد کا ہے) تو معلوم ہوا کہ یہاں قلم دوات پنسل وغیرہ بیچنے کی کوئی دکان نہیں، کاغذ البتہ قصاب کی دکان پر ملتے ہیں۔ ان صاحب نے یہ ذکر نہیں کیا کہ اُن دِنوں گوشت کہاں سے ملتا تھا۔ غالباً درزی کی دکان پر جاتے ہوں گے۔

+++++

متفرقاتِ کابل

ہم کابل گئے لیکن غلط وقت۔ وہاں کچھ اور وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا۔ اپریل کے مہینہ میں گل بوٹے جاگ اٹھتے ہیں اور اگر غالب کے معنوں میں نہ لیا جائے تو در و دیوار پر سبزہ اُگ آتا ہے۔ برگ درختانِ سبز اور اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیراہنوں والے پھول۔ یہ ہے وہ بہار جس پر بابر بادشاہ لہلوٹ ہوا تھا اور وصیت کر گیا تھا کہ میری موت کہیں بھی ہو، میری آخری آرام گاہ کابل ہی میں بنی چاہیے۔ ہم سے ہمارے میزبانوں اور دوستوں نے اہلاً و سہلاً تو کہا لیکن یہ بھی کہا کہ میاں کیوں دسمبر میں آگئے۔ وہ بھی رمضان شریف کے دنوں میں۔ اپریل میں آؤ اور پغمان دیکھو۔ پغمان تو خیر دُور کی بات ہے ان دِنوں تو تمہارا یہ زرنگار پارک بھی پھولے نہیں سماتا۔

زرنگار پارک ہمارے ہوٹل کے بالکل پہلو میں تھا۔ بس سڑک درمیان میں تھی۔ اس وقت تو اس کا ایک پتہ بھی سبز نہ تھا۔ سردی سے ساری گھاس جھلسی ہوئی اور روشیں زرد سارے درخت لنڈ منڈ اور سارے خیاباں ویران۔ باہر کا باغ، شہر نو پارک، چمن حضوری.... جہاں جہاں ہمارا شوقِ گلگشت ہمیں لے گیا یہی کیفیت تھی۔ خاک اڑتی تھی اس شہر میں جس کا قصیدہ صائب تبریزی اس شعر سے شروع کرتا ہے۔

؎ خوشا عشرت سرائے کابل و دامانِ کہسارش
کہ ناخن بر دل گل می زند مژگانِ ہر خارش

اور اس بیت پر ختم۔

؎ تعالیٰ اللہ از باغِ جہاں آرا و شہر آرا
کہ طوبیٰ خشک بر جا ماندہ است از رشکِ اشجارش

زرنگار پارک پہلے خاصا وسیع تھا۔ اب سمٹ گیا ہے اور کئی سرکاری عمارتوں نے اس کا پہلو دبا لیا ہے۔ اس میں کئی تاریخی یادگاریں ہیں۔ اس کونے پر جو ہمارے ہوٹل کی طرف پڑتا ہے امیر عبدالرحمٰن کا سادہ اور سفید مقبرہ ہے۔ امیر عبدالرحمٰن وہ بادشاہ تھے جن کے رعب اور ہیبت

سے دھرتی کانپتی تھی۔ انھوں نے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۱ء تک حکومت کی۔ اس وقت افغانستان میں تین طاقتیں تھیں۔ ایک بادشاہ، دوسرے خوانین اور تیسرے مُلّا۔ امیر عبدالرحمٰن نے مُلّا کو تو ساتھ ملائے رکھا۔ خوانین کی بیخ کنی کی کہ کل کلاں کوئی اور دعویدار تخت کا نہ پیدا ہو جائے۔ امیر عبدالرحمٰن نے یورپ کا سفر بھی کیا اور باغ بالا میں ہم نے وہ نوادر دیکھے جو موصوف نے اس سیاحت میں جمع کیے تھے۔ ان کے سفر یورپ کے کئی قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہی کہ ملکہ وکٹوریہ نے دعوت پر بلایا تو انھوں نے چھری کانٹے کو نظر انداز کر کے مرغ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دانتوں سے چچوڑنا شروع کیا اور ہڈیاں زمین پر پھینکیں، مہمان عالی مقام کے احترام میں ملکہ وکٹوریہ نے بھی یہی کیا اور فرش پر ہڈیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اس کے بعد ہاتھ دھونے کے لئے پانی کے پیالے (فنگر باؤل) سامنے آئے تو امیر صاحب نے اپنا پیالہ غٹا غٹ پی لیا۔ ملکہ معظمہ اور اُن کے درباریوں کو بھی یہی کرنا پڑا۔ کتابوں میں آیا ہے کہ منتظم بہت اچھے تھے۔ اچھے کا مطلب سخت گیر سمجھیے۔ ان کے زمانے تک شاہی محل پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ بالا حصار ہی میں ہوتا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اسے ترک کر کے نیچے میدان میں قلعہ بنایا جسے ارک کہتے ہیں اور جواب بھی شاہی مستقر ہے۔ اللہ بخشے مستبد اور شقی القلب اس درجہ تھے کہ تین سگے بھائیوں کو محض اس جرم کی پاداش میں قتل کرا دیا کہ ان میں سے ایک نے خواب میں خود کو بادشاہ بنتے دیکھا تھا۔ اس شامت کے مارے نے صبح اٹھ کر اپنے دوسرے بھائی سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے اُسے منع کیا کہ کسی اور سے نہ کہنا لیکن بات کسی طور باہر نکل گئی اور امیر عبدالرحمٰن نے دونو کو پکڑ منگوایا حتیٰ کہ ان کے تیسرے بھائی کو بھی جو کابل سے کوسوں دور تھا۔ امیر نے جلاد کو حکم دیا کہ تینوں کے سر قلم کر دو۔ اس پر دوسرے بھائی نے کہا۔ مجھے تو نہ مارو۔ میں نے تو خواب دیکھا نہیں، فقط سنا ہے۔ تیسرا بولا، حضور میں نے تو سنا بھی نہیں میں تو کابل سے باہر تھا۔ لیکن امیر نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور تینوں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ انہی بزرگ کے عہد میں شنواریوں نے بغاوت کی تو اس کی ناکامی کے بعد ان قبائل کے سرداروں کے سروں سے ایک اونچا مینار تعمیر کیا گیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے مقبرے کی عمارت زیادہ بڑی نہیں لیکن اس کی سادگی میں شکوہ ہے۔ ساتھ ہی اس اندازِ تعمیر کی ایک چھوٹی سی مسجد جس کے صحن میں پچیس تیس آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہوگی۔ مقبرے کے برآمدوں میں مختلف کتبے اور شاعروں کے قصیدے سنگ مرمر پر کندہ ہیں۔ جن میں ان کو کیواں بارگاہ اور نوشیرواں ثانی اور رحمت و بخشش اور جود و سخا کا منبع بتایا گیا ہے۔ خیر وہ اور زمانہ تھا۔ امیر عبدالرحمٰن تو پھر بادشاہ تھے ان کے قصیدے نہ لکھتے تو وہ ان کی کھال کھنچوا دیتا۔ معمولی ڈپٹی کمشنروں اور انسپکٹر تعلیمات وغیرہ کے خیر مقدم میں بھی ہم نے لوگوں کو اس سے زیادہ لکھتے دیکھا ہے۔ مقبرے سے تھوڑی دُور زرنگار پارک ہی میں غازی امان اللہ خان کے دو بھائیوں کی قبریں ہیں جو سقہ کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے ان مزاروں کی لوحیں اکھڑی ہوئی ہیں۔ پندرھویں صدی کے ایک بزرگ محمد ابن احمد الحصاری کا مزار بھی ایک چھوٹی سی بُرجی کے نیچے اس کے پاس ہے۔ پارک کے اس علاقے میں تاجداروں کے محل بنے بھی اور ڈھے بھی گئے جن میں ایک وہ تھا جس میں ۱۹۲۱ء میں افغانستان کی دستاویز آزادی پر دستخط ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں پیوند زمین کر دیا گیا۔ ایک اور محل یہاں امیر عبدالرحمٰن نے اپنی چہیتی بیوی کے لئے بنوایا تھا اور جس کا ایک حصہ اب بھی کھڑا ہے اور بوبو جان کہلاتا ہے۔

کہتے ہیں شہنشاہ بابر کے چچا الغ بیگ نے پندرھویں صدی میں یہاں ایک باغ بنایا تھا۔ جس کی جگہ بعد میں بستان سرائے کے باغ نے لی۔ پارک کے اُس سرے پر جو دریائے کابل کی طرف کو ہے اور جہاں اب پشتانی تجارتی بنک اور پی آئی اے کا دفتر ہے۔ ایک چوبی عمارت شیرینی رکھنے کے لئے مخصوص تھی۔ امیر عبدالرحمٰن کے زمانے میں اور اس کے جانشین کے دور میں بھی یہ دستور تھا کہ اگر کوئی امیر سلام خانے میں بادشاہ کو سلام کرنے آتا تھا تو اُسے ایک چمکدار ریشمی رومال میں مصری کا ایک ڈلا باندھ کے دیتے تھے۔ ڈلے کا حجم اس امیر کے درجے کی نسبت سے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سیر شیرینی یعنی شکر آمیز میوے بھی عطا ہوتے تھے۔ چونکہ مختلف تقریبات پر سلام کرنے کے لئے بے شمار لوگ آتے تھے لہٰذا منوں شیرینی اور مصری تقسیم ہوتی تھی۔ اب نہ شیرینی کا محل ہے، نہ امیر عبدالرحمٰن۔ اب اس جگہ پر حمال

اور مزدور بیٹھ کر دھوپ تاپتے ہیں اور کپڑوں میں سے جوئیں چُن چُن کر مارتے ہیں۔

اس پارک کو شہر کا قلب جاننا چاہیئے۔ ایئر پورٹ جانے کا راستہ یہی ہے۔دونو اچھے ہوٹل...کابل اور سپین زر....یہیں واقع ہیں۔ افغان اریانا اور پی آئی اے کے دفاتر بھی یہاں ہیں۔ اطلاعات اور تعلیمات کی وزارتوں کے جدید دفاتر بھی اس سے ملے ہوئے ہیں اور پرانی وزارت خارجہ بھی سامنے نظر آتی ہے۔ ایک سڑک مسجد پل خشتی کی طرف کو نکل گئی ہے۔ ایک مقبرہ تیمور شاہ اور ماشین خانے کے پاس سے ہوتی ہوئی دارالامان اور یونیورسٹی اور باغ بابر کی طرف چلی گئی ہے۔ پھر ایک دروازہ ارک کا بھی پارک کی طرف پڑتا ہے اور شہر نو باغ بالا۔ پغمان وغیرہ جانے کی شاہراہ بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے جو سڑک پرانی وزارتِ خارجہ کے سامنے پڑتی ہے اس پر مختلف ملکوں کے سفارت خانے ہیں۔ یہیں اقوام متحدہ کا دفتر ہے جہاں ہمیں اپنے کام سے جانا پڑتا تھا اور چینی سفارت خانے سے اس کی دیوار ملی ہوئی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس ہمسائیگی کے باوجود اقوام متحدہ والے چین والوں کو نہیں پہچانتے۔ ان کا سائن بورڈ دیکھ کر انجان بن کر گزر جاتے ہیں اور چین والے تو اتنی گھاس بھی نہ ڈالتے ہوں گے۔ ان کے نام کی تختی بھی نہ پڑھتے ہوں گے۔

اس سڑک کے کونے پر ایک روز ہم نیشنل لائبریری میں گھس گئے۔ پرانے زمانے کی خستہ عمارت ہے۔ کبھی یہاں کوئی سرکاری دفتر ہوا کرتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے تنگ و تاریک زینے ہیں لیکن کتابوں کا ذخیرہ نادر ہے۔ مجلس ادبی جس کے علامہ اقبال اور مولانا سلیمان ندوی مہمان ہوئے تھے۔ اس کا کتب خانہ بھی اب اس لائبریری کا جزو ہے۔ کوئی اسی ہزار کتابیں ہیں، فارسی کی، انگریزی کی اور اُردو کی بھی۔ اُردو کا ذخیرہ نہ جانے کس زمانے میں بنا ہوگا۔ اگرچہ انجمن ترقی اُردو کی کتابیں بھی ہیں لیکن زیادہ تر رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اور منشی محبوب عالم کے زمانے کی ہیں۔ قصے کہانیاں ہیں جن کی مشترکہ جلدیں بنی ہوئی ہیں۔ پرانے پرچوں میں اصلاح، انیس، امان، افغان وغیرہ کے فائل بھی یہاں ہیں۔ کہیں اور شاید نہ ملیں۔ انگریزی سیکشن میں ہم نے زیادہ تر انیسویں صدی کی وہ کتابیں دیکھیں جو ۴۲-۱۸۳۹ء کی پہلی افغان جنگ کے متعلق انگریزوں نے لکھ رکھی ہیں۔ یہ جنگ جس میں انگریزی سپاہ ایسی تباہ ہوئی تھی کہ اٹھارہ بیس ہزار کی فوج میں سے فقط ایک آدمی ڈاکٹر برائیڈن گرتا پڑتا زخمی حالت میں جلال آباد پہنچا تھا، انگریزوں کو آج تک نہیں بھولی۔ بیسوں کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں اور آج تک لکھی جارہی ہیں۔ مصوروں نے اس واقعہ ہائلہ پر موقلم آزمایا اور اس کی خیالی تصویریں لندن کی سٹیٹ گیلری میں لگی ہوئی ہیں۔ اخباروں کے فائلوں میں ہمیں حبیب الاسلام کی تلاش تھی یہ اخبار بچہ سقہ نے جاری کیا جو خود کو محافظ اسلام امیر حبیب اللہ کہلاتا تھا۔ جب تک بچہ سقہ رہا یہ پرچہ بھی چھپتا رہا۔ اس کے مندرجات عبرت انگیز ہیں۔ یہ قزاق خود کو محافظ اسلام کہتا تھا۔ لوگ بھی اسے یہی کہتے تھے بلکہ ہر روز "حبیب الاسلام" میں ایک لمبی فہرست بیعت کرنے اور اطاعت قبول کرنے والوں اور امان اللہ پر تبرّہ بھیجنے والوں کی چھپتی تھی۔

(ابن انشا کے سفرنامہ "دنیا گول ہے" سے لیا گیا اُنکا سفرِ افغانستان)

☆☆☆☆☆

اُردو کی آخری کتاب

(جولائی ۱۹۷۱ء)

جب ابن انشاء نے یہ کتاب لکھی اور چھاپنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ کتاب کورس میں شامل ہو جائے کیونکہ اس سے پہلے پرائمری کے نصاب میں فلمی نغمات کی شمولیت کا حادثہ رونما ہو چکا تھا اور لوگوں کا اندیشہ بجا تھا اسلئے ابن انشاء نے امتحاناً اس کتاب کا مسودہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئر مین نسیم محمود کو بھجوا دیا لیکن انھوں نے اسے نامنظور کر دیا اور لکھا ''آپ کی جدید اردو ریڈر پر گہرا غور خوض کیا گیا۔ ہماری رائے میں یہ طلبا کو باقی ۵۷۶ درسی کتب سے بے نیاز کرنے کی ایک خطرناک کوشش ہے۔ خدشہ ہے کہ اسے پڑھ کر استاد طالب علم اور طالب علم استاد بن جائیں گے، لہذا ٹیکسٹ بک بورڈ اسے نامنظور کرنے میں مسرت کا اظہار کرتا ہے۔(چیئر مین میر نسیم محمود۔۱۸ جنوری ۱۹۷۱ء)''

اس کتاب کے مضامین کے بارے میں ابن انشا کی اپنی رائے ہے ''ہم نے اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں لکھی، ویسے تو آجکل کسی بھی کتاب میں کوئی نئی بات لکھنے کا رواج نہیں لیکن ہم نے بالخصوص وہی کچھ لکھا ہے جو برسوں پہلے پڑھا تھا۔ اتنا ہے کہ یہ دن بڑے ہنگاموں کے تھے۔ صدر ایوب گئے۔ جلسے جلوس آئے۔ جمہوریت، سوشلزم، فتوے اور الیکشن کے غلغلے بلند ہوئے۔ اس شور میں تاریخ، جغرافیہ حساب گرائمر سبھی اسباق میں کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہو گئی۔ تاریخ ہند میں نئے پرانے بادشاہ باہم خلط ملط ہو گئے۔ اکبر کے نورتنوں میں بھی اُدل بدل ہو گئی حتیٰ کہ مناظر قدرت اور ستاروں کے احوال لکھتے ہوئے بھی ہماری نظریں آسمان سے زیادہ زمین پر رہیں۔ بعض بادشاہوں کا احوال ہمیں اولیا اللہ کے باب میں لکھنا تھا لیکن بادشاہوں ہی میں لکھ گئے ہیں۔ اس میں ہماری نیت کا قصور نہیں، تاریخی واقعات کا قصور ہے۔ پڑھتے ہوئے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ یہ کتاب صرف بالغوں کے لئے ہے۔ ذہنی بالغوں کے لئے، عمر نابالغوں کے لئے نہیں۔(ابن انشاء جولائی ۱۹۷۱ء)''

(ادارہ)

ہمارا ملک

(۲۴، دسمبر ۱۹۶۹ء)

''ایران میں کون رہتا ہے؟''

''ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔''

''انگلستان میں کون رہتا ہے؟''

''فرانس میں کون رہتا ہے؟''

''فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے''

''یہ کون سا ملک ہے؟''

''یہ پاکستان ہے۔''

''اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟''

''نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔''

''اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔''

''اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔''

''اس میں بنگالی قوم رہتی ہے۔''

''اس میں یہ قوم رہتی ہے اس میں وہ قوم رہتی ہے۔''

''لیکن......پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں!

سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں!

بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں!

پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟''

''غلطی ہوئی معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔''

(یہ نظم صدر ایوب کے دور حکومت میں اٹھنے والے لسانی تنازعے کی مزمت میں لکھی گئی، اس تنازعے کے نتیجے میں ہی سقوط ڈھاکہ کا سانحہ رونما ہوا۔ ادارہ)

++++++

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خودنوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں لکھیں، بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حُسنِ انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اُچھالتے اُچھالتے ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک، بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لئے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اُسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اُس کی کامرانی کے لئے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں

عفواور درگزر کا مادہ از حد تھا۔ اگر کوئی آ کر شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیالی ہے، یا فلاں کارخانے پر قبضہ کرلیا ہے، تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمال سیر چشمی سے اُسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لے کر تارکِ دُنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(اس مضمون میں ''بادشاہ'' سے مراد صدر ایوب خان ہے۔ ادارہ)

++++++

برکات حکومتِ غیر انگلشیہ

عزیزو، بہت دن پہلے اس ملک میں انگریزوں کی حکومت ہوتی تھی اور درسی کتابوں میں ایک مضمون ''برکات حکومت انگلشیہ'' کے عنوان سے شامل رہتا تھا۔ اب ہم آزاد ہیں اُس زمانے کے مصنف حکومتِ انگلشیہ کی تعریف کیا کرتے تھے، کیونکہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہم اپنے عہد کی آزاد اور قومی حکومتوں کی تعریف کریں گے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

عزیزو! انگریزوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے لیکن اُن کے زمانے میں خرابیاں بہت تھیں۔ کوئی حکومت کے خلاف بولتا تھا یا لکھتا تھا تو اس کو جیل بھیج دیتے تھے.... اب نہیں بھیجتے۔ رشوت ستانی عام تھی، آج کل نہیں ہے۔ دکاندار چیزیں مہنگی بیچتے تھے اور ملاوٹ بھی کرتے تھے۔ آج کل کوئی مہنگی نہیں بیچتا، ملاوٹ بھی نہیں کرتا۔ انگریزوں کے زمانے میں امیر اور جاگیردار عیش کرتے تھے، غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اب امیر لوگ عیش نہیں کرتے اور غریبوں کو ہر کوئی اتنا پوچھتا ہے کہ وہ تنگ آجاتے ہیں۔ خصوصاً حق رائے دہندگی بالغاں کے بعد سے۔

تعلیم اور صنعت وحرفت کو لیجیے۔ ربع صدی کے مختصر عرصے میں ہماری شرح خواندگی اٹھارہ فی صدی ہوگئی ہے۔ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ایسا ہوسکتا تھا؟ انگریز شروع شروع میں ہمارے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹ دیتے تھے، اب کارخانوں کے مالک ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ دستکاروں کے انگوٹھے نہیں کاٹتے۔ ہاں کبھی کبھی پورے دستکار کو کاٹ دیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندو بنیئے اور سرمایہ دار ہمیں لوٹا کرتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ختم ہو اور ہمیں مسلمان بنئے اور سیٹھ لوٹیں۔ الحمداللہ کہ یہ آرزو پوری ہوئی۔ جب سے حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی ہے ہم نے ہر شعبے میں بہت ترقی کی ہے۔ درآمد برآمد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہماری خاص برآمدات دو ہیں۔ وفود اور زرمبادلہ۔ درآمدات ہم گھٹاتے جارہے ہیں۔ ایک زمانہ میں تو خارجہ پالیسی تک باہر سے درآمد کرتے تھے۔ اب یہاں بننے لگی ہے۔

++++++

ایک سبق جغرافیے کا

جغرافیہ میں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا گول ہے۔ ایک زمانے میں بے شک یہ چپٹی ہوئی تھی۔ پھر گول قرار پائی۔ گول ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ مشرق کی طرف سے جاتے ہیں مغرب کی طرف جا نکلتے ہیں۔ کوئی ان کو پکڑ نہیں سکتا۔ اسمگلروں مجرموں اور سیاست دانوں کے لئے بڑی آسانی ہوگئی۔

ہٹلر نے زمین کو دوبارہ چپٹا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ پرانے زمانے میں زمین گل محمد کی طرح ساکن ہوتی تھی۔ سورج اور آسمان وغیرہ اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔ پھر گلیلیو نامی ایک شخص آیا اور اس نے زمین کو سُورج کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ پادری بہت ناراض ہوئے کہ یہ ہم کو کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ گلیلیو کو تو انھوں نے قرار واقعی سزا دے کر آئندہ اس قسم کی حرکات سے روک دیا۔ زمین کو البتہ نہیں روک سکے۔ برابر حرکت کئے جا رہی ہے۔

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے۔ لوگ خاصی امن چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پندرھویں صدی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا قصور نہیں یہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا، غلطی سے امریکہ کو دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریئے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں، کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی یعنی امریکہ دریافت کیا۔ بہر حال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی۔ کولمبس تو مر گیا، اس کا خمیازہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

پاکستان

حدود اربعہ: پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے، مغرب میں سنٹو، شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی۔ یعنی جائے مفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ یہ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پر ہیں۔ کتنے بڑے فاصلے پر، اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔

دونوں کا اپنا اپنا حدود اربعہ بھی ہے۔

مغربی پاکستان کے شمال میں پنجاب، جنوب میں سندھ، مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں۔ یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے اور واقع ہے بھی کہ نہیں اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔

مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

بھارت

یہ بھارت ہے۔ گاندھی جی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کو مہاتما کہتے تھے۔ چنانچہ مار کر ان کو یہیں دفن کر دیا اور سمادھی بنا دی، دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اگر گاندھی جی نہ مرتے یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کے لیئے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لیئے بھی تھا۔ ہمیں قائداعظم کا ممنون ہونا چاہیئے کہ خود ہی مر گئے اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی ورنہ شاید ہمیں بھی ان کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے ساتھ ہوا، اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے۔ بھارتی اسی کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں اور اسی کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں، کیونکہ خود وہ گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔

آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔ اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا اشوکا ہوٹل یادگار ہیں اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے جو اشوک کے تمام یادگاروں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ راجہ نہرو بڑے دھرماتما آدمی تھے۔ صبح سویرے اُٹھ کر شیر شک آسن کرتے تھے۔ یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کو ہر معاملے کو الٹا دیکھنے کی عادت ہوگئی۔ حیدر آباد کے مسئلہ کو انھوں نے رعایا کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور کشمیر کے مسئلہ کو راجا کے نقطۂ نظر سے۔ یوگ میں طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ ناواقف لوگ ان کو قلابازیاں سمجھتے ہیں۔ نہرو جی نفاست پسند بھی تھے۔ دن میں دوبارا اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

(۸، فروری ۱۹۷۰ء)

++++++

ایک سبق گرامر کا

لفظوں کے اُلٹ پھیر کے علم کو گرامر کہتے ہیں۔ لفظوں کا مجموعہ جملہ کہلاتا ہے۔ یہ مجموعہ زیادہ بڑا اور لمبا ہو جائے تو اُسے میر جملہ کہتے ہیں۔

اب چونکہ جملے بازی اور فقرے بازی لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے گرامر کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوگئی ہے۔

شاعری کی گرامر کو عروض کہتے ہیں۔

پُرانے لوگ عروض کے بغیر شاعری نہیں کیا کرتے تھے۔ آج کل کے کسی شاعر کے سامنے عروض کا نام لیجئے تو پوچھتا ہے وہ کیا چیز ہوتی

ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے سامنے زحافات کا نام لیا--- بولے خرافات؟ مجھے خرافات پسند نہیں۔ بس میری غزل سنیئے اور جایئے۔

عروض میں بحریں ہوتی ہیں جن میں بعض بہت گہری ہوتی ہیں۔ نومشق ان میں اکثر ڈوب جاتے ہیں۔ اسی لئے احتیاط پسند لوگ شاعری اور عروض کے پاس نہیں جاتے عمر بھر نثر لکھتے رہتے ہیں۔

لفظ اور صیغے

پرانے زمانے میں تذکیروتانیث کے قاعدے مقرر تھے۔ قاعدہ یاد نہ ہوتو لباس اور بالوں وغیرہ سے پہچان ہوجاتی تھی۔ اب مخاطب سے پوچھنا پڑتا ہے کہ تو مذکر ہے یا مؤنث ہے اور بتا تیری رضا کیا ہے؟ اس کے بعد اس سے صحیح صیغے میں گفتگو کرتے ہیں یا ایران ہو تو اس کے ساتھ صیغہ کرتے ہیں۔

بہت سے واحد ایک جگہ اکٹھے ہوں تو جمع کے صیغے میں آجاتے ہیں۔ جمع کے صیغے میں تھوڑی احتیاط ضروری ہے خصوصاً جن دنوں شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہو۔ ان دنوں جمع نہیں ہونا چاہئے۔ واحد رہنا ہی اچھا ہے۔

فعل ماضی

ماضی میں کسی شخص نے جو فعل کیا ہو اُسے فعل ماضی کہتے ہیں۔ کرنے والا عموماً اسے بھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لوگ نہیں بھولتے۔

ماضی کی کئی قسمیں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور "شاندار ماضی" ہے۔ جس قوم کو اپنا مستقبل ٹھیک نظر نہ آئے وہ اس صیغے کو بہت استعمال کرتی ہے۔

ایک ماضی شکیہ ہے۔ جن لوگوں کا ماضی مشکوک ہو وہ ماضی شکیہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ عموماً ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔

ماضی شرطی یا ماضی تمنائی۔ جن لوگوں نے ریس میں یا تاش پر شرطیں بد بد کر اپنا ماضی تباہ کیا ہو اُن کی ماضی کو شرطی کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی تمنا ہوتی ہے کہ اور پیسے آئیں تو ان کو بھی ریس میں لگائیں اس لئے شرطی اور تمنائی دونوں ماضیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

ماضی کی دو اور قسمیں ماضی قریب اور ماضی بعید ہیں۔ ماضی کو حتی الوسع قریب نہ آنے دینا چاہیئے۔ جتنی بعید رہے گی اور جتنے اس پر پردے پڑے رہیں گے، اتنی ہی بھلی معلوم ہوگی۔ ماضی کا بعید رہنا مستقبل کے لئے بھی اچھا ہے۔

فعل مستقبل

جو لوگ آج کا کام ہمیشہ کل پر ٹالتے ہوں ان کے ہر فعل کو فعل مستقبل کہا جاتا ہے۔ میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا، فعل مستقبل ہی کی مثالیں ہیں۔ الیکشن وغیرہ کے دنوں میں ساری گفتگو عموماً فعل مستقبل کے صیغوں ہی میں ہوتی ہے۔

فعل کی دیگر قسمیں

فعل کی بنیادی قسمیں دو ہیں۔ جائز فعل، ناجائز فعل۔ ہم صرف جائز قسم کے افعال سے بحث کریں گے کیونکہ دوہیم پر پنڈت کوکا آنجہانی اور جناب جوش ملیح آبادی مبسوط کتابیں لکھ چکے ہیں۔

فعل کی دو قسمیں فعل لازم اور فعل متعدی بھی ہیں۔ فعل لازم وہ ہے جو کرنا لازم ہو۔ مثلاً افسر کی خوشامد، حکومت سے ڈرنا، بیوی سے جھوٹ بولنا وغیرہ۔

فعل متعدی عموماً متعدی امراض کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ایک شخص کنبہ پروری کرتا ہے۔ دوسرے بھی کرتے ہیں۔ ایک رشوت لیتا ہے۔ دوسرے اس سے بڑھ کر لیتے ہیں۔ ایک بناسپتی گھی کا ڈبہ پچیس روپے میں کر دیتا ہے دوسرا گوشت کے ساڑھے بارہ روپے لگاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ دونوں اپنے فعل متعدی کو فعل لازم قرار دیتے ہیں۔ ان افعال میں گھاٹے میں صرف مفعول رہتا ہے یعنی عوام۔ فاعل کی شکایت کی جائے تو وہ فائیل میں دَب جاتی ہے۔

فعل حال

یہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے اچھا حال اور بُرا حال۔ بیمار کا حال عموماً بُرا حال ہوتا ہے لیکن اُن کے دیکھے سے جو منہ پر رونق آجاتی ہے تو وہ سمجھتا ہے اچھا ہے۔

''اُن'' حرفِ اشارہ ہے۔ یہ اشارہ محبوب کی طرف ہے۔ عزیز طالب علمو! تم اپنے محبوب کی طرف یا محبوب سے اشارہ کر سکتے ہو، لیکن اپنی ذمہ داری پر۔

(۱۴، فروری ۱۹۷۱ء)

++++++

ریاضی کے قاعدے

ابتدائی حساب

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں:

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم۔

جمع

جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں۔

خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں

سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے

کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔

جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہے۔

عام لوگوں کے لئے ۱+۱= ۲/۱۱،

کیونکہ ۲/۱ انکم ٹیکس والے لے جاتے ہیں۔

تجارت کے قاعدے سے جمع کریں تو ۱+۱ کا مطلب ہے گیارہ

رشوت کے قاعدے سے حاصل جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

قاعدہ وہی اچھا جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے۔ بشرطیکہ پولیس مانع نہ ہو۔

ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے

یہ ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے

آزمودہ ہے۔

تفریق

میں سندھی ہوں، تو سندھی نہیں ہے

میں بنگالی ہوں، تو بنگالی نہیں ہے

میں مسلمان ہوں، تو مسلمان نہیں ہے

اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں

حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے

تفریق کا ایک مطلب ہے، منہا کرنا

یعنی نکالنا ایک عدد میں سے دوسرے عدد کو

بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں

بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے

ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے

فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے

ایک بات یاد رکھیئے

جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں

وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں

انسانوں اور انسانوں میں

مسلمانوں اور مسلمانوں میں

عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے

کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا

آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے

ضرب

تیسرا قاعدہ ضرب کا ہے

ضرب کی کئی قسمیں ہیں

مثلاً ضربِ خفیف، ضربِ شدید، ضربِ کاری وغیرہ

ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے۔

پتھر کی ضرب، لاٹھی کی ضرب، بندوق کی ضرب

علامہ اقبال کی ضربِ کلیم ان کے علاوہ ہے

حاصلِ ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے یا لگائی گئی ہے۔

آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔

لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو۔

ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے تعزیراتِ پاکستان پڑھ لینی چاہیئے۔

تقسیم

یہ حساب کا بڑا ضروری قاعدہ ہے۔ سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔

تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا

اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا بندر کا بلّیوں میں روٹی بانٹنا

چوروں کا آپس میں مال بانٹنا

اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا

مِل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے

دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھانی چاہیئے

ورنہ قبض کرتی ہے

تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں ہے

حقوق اپنے پاس رکھیئے

فرائض دوسروں میں بانٹ دیجئے

روپیہ پیسہ کیسے میں ڈالیئے

قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجئے

آپ کو مکمل پہاڑہ مع گُر یاد ہو

تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ آخر کو ۱۲ کروڑ کی دولت کو ۲۲ خاندانوں نے آپس میں تقسیم کیا ہی ہے؟ کسی کو پتہ چلا؟

سوالات

۱۔ تفریق کے قاعدے سے دودھ میں سے مکھی نکالو۔

۲۔ آدمی ضربِ مسلسل کی تاب کہاں تک لاسکتا ہے؟

۳۔ جو اندھے نہیں، وہ بھی ریوڑیاں اپنوں ہی میں کیوں بانٹتے ہیں؟

(۳۰، مارچ ۱۹۷۰ء)

+++++

ابتدائی الجبرا

یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے۔ چونکہ طالب علم اس سے گھبراتے ہیں اور یہ جبراً پڑھایا جاتا ہے۔ اس لئے الجبرا کہلاتا ہے۔

حساب اعداد کا کھیل ہے، الجبرا حرفوں کا۔ ان میں سب سے مشہور حرف ''لا'' ہے۔ جسے لا لکھتے ہیں۔ اس کے کچھ معنی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے ــــ کہ کسی اور لفظ کے ساتھ لگ جائے تو اس کے معنی بھی سلب کر لیتا ہے جس طرح لامکاں، لادوا، لاولد وغیرہ۔ بعض مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً لاہور، لاڑکانہ، لالٹین اور لالوکھیت وغیرہ۔ اگر ان لفظوں کے ساتھ لا نہ ہو، تو ہور، ڑکانہ، لٹین اور لوکھیت کے کچھ معنی نہ نکلیں۔

آزمائے کو آزمانا جہل کہتے ہیں، لیکن الجبرا میں آزمائے کو ہی آزماتے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھوں کو نئے سرے اس ا ب ج سکھاتے ہیں بلکہ ان کے مربعے بھی نکلواتے ہیں۔

الجبرا کا ہماری طالب علمی کے زمانے میں کوئی خاص مصرف نہ تھا اس سے صرف اسکولوں کے طلبہ کو فیل کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن آج کل یہ عملی زندگی میں خاصا استعمال ہوتا ہے دکاندار لوگ اس قاعدے کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

پیسہ لا اور لا اور لا

بعض رشتوں میں الجبرا یعنی جبر کا شائبہ ہوتا ہے، جیسے مدر اِن لا، فادر اِن لا وغیرہ

مارشل لا کو بھی الجبرے ہی کا ایک قاعدہ سمجھنا چاہیئے۔

سوالات

۱۔ لا کا مرّبہ ڈالو۔ بوتل میں ڈالو گے یا مرتبان میں؟

۲۔ لالا لاجپند کو لا سے تقسیم کرو۔

++++++

ابتدائی جیومیٹری

جیومیٹری لکیروں کا کھیل ہے۔ علمائے جیومیٹری کو ہم لکیر کے فقیر کہہ سکتے ہیں۔ دنیا نے اتنی ترقی کر لی۔ ہر چیز بشمول سائنس اور مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن جیومیٹری والوں کے ہاں اب تک زاویہ قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے اور مثلث کے اندرونی زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے سے تجاوز نہیں کر پایا۔ امریکہ اور روس، اور ہر معاملہ میں لڑتے ہیں اس معاملے میں ملی بھگت ہے۔ ہم اپنے ملک میں اپنی پسند کا نظام لائیں گے تو اپنی اسمبلی میں ایک قانون بنوائیں گے، چند درجے ضرور بڑھائیں گے۔ مستطیل بھی جیسی پرانے زمانے میں چورس ہوتی تھی ویسی آج کل ہے۔ کسی کی یہ توفیق تک نہ ہوئی کہ اس کے چار سے پانچ یا چھ ضلعے کر دے۔ ایک آدھ فالتو رہے تو اچھا ہی ہے۔ مغربی پاکستان کے ضلعوں میں ہم رڈوبدل کرتے رہتے ہیں تو مستطیل وغیرہ کے ضلعوں میں کیوں نہیں کر سکتے؟

جیومیٹری میں بنیادی چیزیں ہیں: خط، نقطہ، دائرہ، مثلث وغیرہ۔ اب ہم تھوڑا تھوڑا حال ان کا لکھتے ہیں۔

خط

خط کی کئی قسمیں ہیں۔

خطِ مستقیم: یہ بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر نقصان اٹھاتا ہے۔ سیدھے آدمی بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

خطِ منحنی: یہ ٹیڑھا ہوتا ہے بالکل کھیر کی طرح۔ لیکن اس میں میٹھا نہیں ڈالا جاتا۔

خطِ تقدیر: اسے فرشتے پکی سیاہی سے کھینچتے ہیں۔ یہ مستقیم بھی ہوتا ہے منحنی بھی۔ اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے۔

خطِ شکستہ: یہ وہ خط ہے جس میں ڈاکٹر لوگ نسخے لکھتے ہیں۔ تبھی تو آج کل اتنے لوگ بیماریوں سے نہیں مرتے جتنے غلط دواؤں کے استعمال سے مرتے ہیں۔

خطِ استوا: یہ اس لئے ہوتا ہے کہ کہیں تو دنیا میں دن رات برابر ہوں۔ کہیں تو مساوات نظر آئے۔

خط کی دو (۲) اور قسمیں مشہور ہیں

۱۔حسینوں کے خطوط: یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں دُور، بہت دُور، افق کے پار جانے کا ذکر ہوتا ہے جہاں ظالم سماج نہ پہنچ سکے۔ یہ تصویر بتاں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حسینوں کے چہرے پر ہوتے ہیں اور جن کو چھپانے کے لئے ہر سال کروڑوں روپے کی کریمیں، لوشن، پوڈر وغیرہ صرف کیے جاتے ہیں۔

ایک خط پرانے اُردو شعرا کے معشوقوں کے چہرے پر آیا کرتا تھا جس کے بعد عاشق کو یہ دوسری قسم کے خط بلکہ رجسٹری لفافے آنے شروع ہو جاتے تھے۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

۲۔متوازی خطوط: یہ ویسے تو آمنے سامنے ہوتے ہیں لیکن تعلقات نہایت کشیدہ۔ ان کو کتنا بھی لمبا کھینچ کے لے جایئے یہ کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے، لیکن ہمارے خیال میں ان کو ملانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی کبھی نہیں کی گئی۔ آج کل بڑے بڑے ناممکنات کو ممکن بنا دیا گیا ہے۔ یہ تو کس شمار قطار میں ہیں۔

نقطہ (٠)

نقطہ یعنی بندی یعنی پوائنٹ۔ یہ محض کسی جگہ کی نشاندہی کے لئے ہوتا ہے۔ جیومیٹری کی کتابوں میں آیا ہے کہ نقطہ جگہ نہیں گھیرتا۔ ایک آدھ نقطے کہ حد تک یہ بات صحیح ہوگی لیکن چھ نقطوں سے تو آپ سارا پاکستان گھیر سکتے ہیں۔

دائرہ

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریب قریب سبھی گول ہوتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات ہے کہ ان میں قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دُگنی ہوتی ہے...... جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی۔ جو کسی نے پُرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا۔ اب تک چلا آ رہا ہے۔

ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے۔ آج کل داخلہ منع ہے۔ صرف خارج کرتے ہیں۔

مثلث

تکون کے تین کونے ہوتے ہیں، چار کونوں والی بھی ہوتی ہوں گی لیکن ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزریں۔

مثلثیں کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً عشق کی مثلث، عاشق محبوب اور رقیب۔ فلم میں بھی یہی مثلث ہوتی ہے لیکن وہاں ان تینوں کو پیسے ملتے ہیں۔ رقابت سے لے کر شادی تک فلم ساز کے خرچ پر ہوتی ہے۔

سوالات

۱۔ خطِ نستعلیق، خطِ استوا اور خط وحدانی میں کیا فرق ہے؟

۲۔ مثلث کے چاروں اضلاع برابر کیوں نہیں ہوتے؟

۳۔ سبزۂ خط پر کتنے پیسے کے ٹکٹ لگتے ہیں؟

(۶، اپریل ۱۹۷۰ء)

++++++

اتفاق میں برکت ہے

ایک بڑے میاں جنھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا بنایا تھا آخر بیمار ہو گئے، مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ ان کو اور تو کچھ نہیں، کوئی فکر تھی تو یہ کہ ان کے پانچوں بیٹوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گاڑھی کیا پتلی بھی نہیں چھنتی تھی۔ لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا حالانکہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ آخر انھوں نے بیٹوں پر اتحاد اور اتفاق کی خوبیاں واضح کرنے کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ ان کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ دیکھو اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں، سب جا کر ایک ایک لکڑی لاؤ۔

ایک نے کہا۔ لکڑی؟ آپ لکڑیوں کا کیا کریں گے؟ دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ بڑے میاں کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ لکڑی نہیں شاید ککڑی کہہ رہے ہیں۔ ککڑی کھانے کو جی چاہتا ہوگا۔ تیسرے نے کہا۔ نہیں، کچھ سردی ہے شاید آگ جلانے کو لکڑیاں منگاتے ہوں گے۔ چوتھے نے کہا، بابو جی کوئلے لائیں؟ پانچویں نے کہا، نہیں اپلے لاتا ہوں۔ وہ زیادہ اچھے رہیں گے۔

باپ نے کراہتے ہوئے کہا ''ارے نالائقو'' میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ کہیں سے لکڑیاں لاؤ۔ جنگل سے۔

ایک بیٹے نے کہا، یہ بھی اچھی رہی، جنگل یہاں کہاں؟ اور محکمہ جنگلات والے لکڑی کہاں کاٹنے دیتے ہیں۔

دوسرے نے کہا۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں، باپو جی، بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔

تیسرے نے کہا۔ بھئی لکڑیوں والی بات اپن کی تو سمجھ میں نہیں آئی۔

چوتھے نے کہا۔ بڑے میاں نے عمر بھر میں ایک ہی تو خواہش کی ہے، اسے پورا کرنے میں کیا ہرج ہے؟

پانچویں نے کہا۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ ٹال پر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔

چنانچہ وہ ٹال پر گیا۔ ٹال والے سے کہا۔ خان صاحب ذرا پانچ لکڑیاں تو دینا۔ اچھی مضبوط ہوں۔

ٹال والے نے لکڑیاں دیں۔ ہر ایک خاصی موٹی اور مضبوط۔ باپ نے دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ بتانا بھی خلاف مصلحت تھا کہ لکڑیاں کیوں منگائی ہیں اور اس سے کیا اخلاقی نتیجہ نکالنا مقصود ہے۔ آخر بیٹوں سے کہا۔ اب لکڑیوں کا گٹھا باندھ دو۔

اب بیٹوں میں پھر چہ میگوئیاں ہوئیں، گٹھا؟ وہ کیوں؟ اب رسی کہاں سے لائیں۔ بھئی بہت تنگ کیا اس بڈھے نے، آخر ایک نے اپنے پاجامے میں سے ازار بند نکالا اور گٹھا باندھا۔

بڑے میاں نے کہا ''اب اس گٹھے کو توڑو۔''

بیٹوں نے کہا ''لو بھئی یہ بھی اچھی رہی۔ کیسے توڑیں۔ کلہاڑا کہاں سے لائیں۔''

باپ نے کہا ''کلہاڑے سے نہیں۔ ہاتھوں سے توڑو، گھٹنے سے توڑو۔''

حکم والد مرگ مفاجات، پہلے ایک نے کوشش کی، پھر دوسرے نے پھر تیسرے نے، پھر چوتھے نے، پھر پانچویں نے۔ لکڑیوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ سب نے کہا ''باؤ جی ہم سے نہیں ٹوٹتا یہ لکڑیوں کا گٹھا۔''

باپ نے کہا ''اچھا اب ان لکڑیوں کو الگ الگ کردو۔ ان کی رسی کھول دو۔''

ایک نے جل کر کہا ''رسی کہاں ہے؟ میرا ازار بند ہے۔ اگر آپ کو کھلوانا تھا تو گٹھا بندھوایا ہی کیوں تھا۔ لاؤ بھئی کوئی پنسل دینا میں ازار بند ڈال لوں پاجامے میں۔''

باپ نے بزرگانہ شفقت سے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''اچھا اب ان لکڑیوں کو توڑو۔ ایک ایک کر کے توڑو۔''

لکڑیاں چونکہ موٹی موٹی اور مضبوط تھیں۔ بہت کوشش کی، کسی سے نہ ٹوٹیں۔ آخر میں بڑے بھائی کی باری تھی۔ اس نے ایک لکڑی پر گھٹنے کا پورا زور ڈالا اور تڑاق کی آواز آئی۔

باپ نے نصیحت کرنے کے لئے آنکھیں یک دم کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑا بیٹا بے ہوش پڑا ہے۔ لکڑی سلامت پڑی ہے۔ آواز بیٹے کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔

ایک لڑکے نے کہا ''یہ بڈھا بہت جاہل ہے۔''

دوسرے نے کہا ''اڑیل، ضدی''

تیسرے نے کہا ''کھوسٹ، سنکی، عقل سے پیدل، گھامڑ۔''

چوتھے نے کہا ''سارے بڈھے ایسے ہی ہوتے ہیں، کمبخت مرتا بھی نہیں۔''

بڈھے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بیٹوں میں کم از کم ایک بات پر تو اتفاق رائے ہوا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور نہایت سکون سے جان دے دی۔

++++++

کتا

کتا پالتو جانور ہے۔ ہمارے شہر کی کارپوریشن اسے پالتی ہے اور مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی ہے۔ کارپوریشن اور بھی جانور پالتی ہے مثلاً مچھر، مثلاً چوہے، لیکن بھونکنے والا جانور یہی ہے۔ کتابوں میں آیا ہے کہ جو کتے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔ کاٹنے والے کو بھونکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھونکتا وہ ہے جسے کاٹا جائے، جس کو گزند پہنچے۔

کتا بڑا وفادار جانور ہے، کارپوریشن بھی اس کی بہت وفادار ہے۔ ان دنوں میں کتے شہریوں کو کاٹتے ہیں، کارپوریشن بھی ان کی ہمدردی میں کاٹنا شروع کردیتی ہے کہ یہ ٹیکس لاؤ۔ ناطقے کے علاوہ کبھی کبھی پانی بھی بند کردیتی ہے جس سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ کارپوریشن کا شجرہ حضرت امام حسین کے کسی صاحب اقتدار ہمعصر سے جاملتا ہے۔

کارپوریشن کے علاوہ نجی شعبے میں بھی کتے ہوتے ہیں۔ رئیسوں کے کتے رئیس ہوتے ہیں، غریبوں کے کتے غریب ہوتے ہیں۔ رئیسوں کے کتے غریبوں پر بھونکتے ہیں۔ غریبوں کے کتے اپنے آپ پر بھونکتے ہیں۔

کتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے عین اس طرح جس طرح شیر کسی دوسرے کی گلی میں کتا بن جاتا ہے۔

کتوں اور عاشقوں میں کئی چیزیں مشترک ہیں، دونوں راتوں کو گھومتے ہیں، اور اپنا کلام پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جگاتے ہیں اور اینٹ پتھر کھاتے ہیں۔ ہاں ایک کتا لیلیٰ کا بھی تھا۔ لوگ لیلیٰ تک پہنچنے کے لئے اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی خوشامد کرتے تھے جس طرح صاحب کے سیکرٹری یا چپڑاسی کی کرنی پڑتی ہے۔

++++++

اخبار

"یہ کونسا اخبار ہے"

"یہ روزنامہ باغ و بہار ہے۔"

اس کی کیا بات ہے؟

مجموعہ معلومات ہے!

یہ لوگوں کو سیدھی راہ بھی بتاتا ہے۔

طاقت کی اکسیری دوائیں بھی بکواتا ہے۔

اس میں فلمی صفحہ بھی ہوتا ہے۔

غازیوں کی تکبیریں بھی ہوتی ہیں۔

حسینوں کی تصویریں بھی ہوتی ہیں۔

دُنیا بھی چست رہتی ہے۔

عاقبت بھی درست رہتی ہے۔

اخبار کے بڑے فائدے ہیں

اخبار نہ ہو تو قوم کی رہنمائی کیسے ہو؟

ایکٹرسوں کی رونمائی کیسے ہو؟

لیڈر اپنی ہوا کس میں باندھے؟

حکیم قبض کی دوا کس میں باندھے؟

پنساری مرچوں کا پڑا کس میں باندھے

یہ اخبار والا بڑا انڈر ہے

باطل سے نہیں ڈرتا

لوگوں سے نہیں ڈرتا

کبھی کبھی خدا تک سے نہیں ڈرتا

بس سرکار سے ڈرتا ہے

بڑا اچھا کرتا ہے

جب تک خوشنودیِ سرکار ہے، اخبار ہے۔

روزگار ہے، کوٹھی اور کار ہے۔

پرانے لوگ ایسا نہیں کرتے تھے

پرانے لوگ بھوکے بھی تو مرتے تھے

پھر بھی میاں اخبار والے

اخبار کالا کر

اپنا کردار کالا مت کر

صرف اخبار بیچ.........ایمان مت بیچ

(یکم دسمبر ۱۹۷۰ء)

++++++

کُرسی

یہ کیا ہے؟ یہ کرسی ہے۔ اس کے کیا فائدے ہیں؟ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ اس پر بیٹھ کر قوم کی بے لوث خدمت بہت اچھی طرح کی جاسکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے تو جب لوگوں میں قومی خدمت کا جذبہ زور مارتا ہے تو وہ کرسی کے لئے لڑتے ہیں بلکہ کرسیوں سے لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے پر کرسیاں اٹھا کر پھینکتے ہیں۔

کرسی بظاہر لکڑی کی معمولی چیز ہے لیکن لوگوں میں اخلاقِ حسنہ یعنی عاجزی فروتنی اور خاکساری پیدا کرتی ہے۔ بڑے بڑے پاٹے خاں

کرسی کے سامنے آتے ہیں تو خودی کو بلند کرنا بھول جاتے ہیں۔ اُسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی کرسی پر نہ بیٹھا ہو تب بھی کرتے ہیں۔

اُردو میں ایک محاورہ ہے کرسی کا احمق۔ خاک نشین لوگ کرسی پر بیٹھنے والوں کو احمق گردانتے ہیں۔ انھیں کرسی کا احمق کہتے ہیں۔ اُدھر کرسی والے بغیر کرسی والوں کو احمق جانتے ہیں۔ ہماری رائے میں دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن بڑا احمق ان میں سے کون ہے؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

کرسی والے کو کرسی کبھی خالی نہیں چھوڑنی چاہیئے دوسرے لوگ فوراً اس پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرسی فولڈنگ اچھی ہے، آدمی جہاں جائے اپنے ساتھ لیتا جائے۔

(یکم دسمبر ۱۹۷۰ء)

+++++

چارپائی

یہ چارپائی ہے۔ اس کے چار پائے ہوتے ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ تین یا دو ہوتے ہیں وہ غلطی پر ہیں...... انسان چارپائی پر لیٹ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شروع میں چوپایہ ہی تھا، بعد میں دو پاؤں پر چلنے لگا۔ چارپائی پر لیٹتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اب اپنی اصل جُون میں آیا۔ اس شوق کو بعض لوگ موٹر وغیرہ کی سواری سے بھی پورا کرتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں پاؤں کی تعداد ہی کا تو فرق ہے۔ موٹر پر سوار ہونے سے یہ فرق بڑی حد تک مٹ جاتا ہے۔ اسی لئے تو دو پاؤں والے ایسے لوگوں کو دیکھ کر دُور ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔

چارپائی بڑے کام کی چیز ہے۔ اس پر لوگ بیٹھتے ہیں، سوتے ہیں، گاتے ہیں، روتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، مرتے ہیں، جیتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ لیٹتے وقت کچھ کتابیں بھی اپنے ساتھ چارپائی پر رکھ لیتے ہیں۔ فارسی میں جو چارپائے بر و کتابے چند، کہا جاتا ہے، اس سے ظرف بھی مراد ہوتا ہے، مظروف بھی۔

چارپائی تخت اور کرسی کے مقابلے میں سستی بھی ہے۔ نادر شاہ ہندوستان آیا تو محمد شاہ کا تخت اٹھا کر لے گیا تھا اور محمد شاہ کو زمین پر بٹھا گیا تھا۔ اگر بادشاہ چارپائی پر بیٹھا ہوتا تو اس کے زمین پر بیٹھنے کی نوبت نہ آتی۔ چارپائی کی مرمت بھی آسان ہے۔ لوگ گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہیں: ''چارپائی بنوالو۔ منجی پیڑھی ٹھکوالو''۔ کوئی چارپائی والا ان سے ٹیڑھی بات کرے تو یہ اس کو بھی ٹھوک دیتے ہیں۔ اس کی بھی کان نکال دیتے ہیں۔ سیدھا کر دیتے ہیں۔

(یکم دسمبر ۱۹۷۰ء)

☆☆☆☆☆☆

(ابنِ انشاء کی تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' سے لئے گئے اُنکے چند مضامین)

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)

دردِ مشترک

تحریر: او ہنری

ترجمہ: ابن انشاء

چور جھپاک سے کھڑکی کے اندر کودا اور پل بھر دم لینے کو ٹھٹک گیا۔ سکہ بند چور گھر کی متاع میں سے کچھ لینے سے پہلے تھوڑا دم ضرور لیتے ہیں۔

کہتے ہیں گھر کے بھاگ دروازے سے پہچانے جاتے ہیں۔ چور نے بھی ایک نظر میں بھانپ لیا کہ بی بی اس وقت کسی ہوٹل میں کسی ہمدرد کے ساتھ بیٹھی رونا رو رہی ہوگی کہ ابھی تک اس کے دل کو کسی نے نہیں سمجھا کسی نے اس کے دکھ کو نہیں اپنایا چوتھی منزل کی سامنے کی کھڑکیوں میں اتنی رات گئے روشنی کا مطلب یہ تھا کہ صاحب خانہ گھر آ گئے ہیں اور جلد ہی بتی بجھا کر سو جائیں گے۔ ستمبر کا مہینہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ہوٹلوں اور کیفوں اور لڑکیوں کی صحبت کو لہو ولعب خیال کرنے لگتے ہیں اور پہلے سے گھر پہنچ کر بی بی کے آنے کی راہ دیکھتے ہیں۔

یہ چور معمولی یعنی تیسرے درجے کا تھا۔ تیسرے درجے کا چور اوباش ہوتا ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کے چوروں کی طرح نہیں جو دن میں جنٹلمین بنے رہتے ہیں۔ عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ اچھے ہوٹلوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں۔ دیواروں پر کاغذ منڈھنے اور فرنیچر وغیرہ مہیا کرنے کے بہانے گھروں کی کھوج لگاتے ہیں اور جھٹ پٹا ہوتے ہی اپنی آئی پر آ جاتے ہیں۔ اخباروں میں ایسے لوگوں کو خوب اچھالا جاتا ہے۔ ان کی، ان کی بیویوں کی بیسیوں آشناؤں کی تصویریں چھاپی جاتی ہیں۔ وہ بیٹھے بٹھائے ہیرو بن جاتے ہیں۔

لیکن یہ چور اس قسم کا نہیں تھا۔ ادنی درجے کا تھا۔ اس کا ٹھاٹ باٹ بڑے چوروں کا سا نہ تھا۔ نہ لالٹین، نہ نقاب، نہ بے آواز تلے والے جوتے۔ بس سیدھا سادھا آدمی تھا۔ منہ میں پیپر منٹ کا چیونگم رکھے جگالی کرتا ہوا۔

فرنیچر پر گرد جم رہی تھی۔ چور کو اس گھر سے کوئی بڑا خزانہ ملنے کی امید نہ تھی اس کی منزل مدھم روشنی والا وہ کمرہ تھا جس میں صاحب خانہ استراحت فرما رہے تھے، وہاں کسی گھڑی، کچھ کھلے پیسوں یا ایسی ہی کسی چیز کا ملنا خارج از امکان نہ تھا وہ کھڑکی کھلی دیکھ کر یونہی اندر گھس آیا تھا۔

چور نے آہستگی سے اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ بتی دھیمی کر دی گئی تھی اور صاحب خانہ سو رہے تھے۔ سنگھار میز پر کئی چیزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔ کچھ چرمر نوٹ۔ ایک گھڑی، چابیاں، کچھ کھلے پیسوں یا ایسی ہی کسی چیز کا ملنا خارج از امکان نہ تھا۔

گھڑی، چابیاں، بجھے ہوئے سگریٹ، بال باندھنے کے گلابی ریشمی فیتے اور ایک بوتل سوڈا واٹر کی۔ صبح دم نوش جان کرنے کے لیے۔

چور نے سنگھار میز کی طرف قدم بڑھایا لیکن یکا یک وہ سویا ہوا شخص پہلو بدل کر جاگ اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کا داہنا ہاتھ تکیے کے نیچے گیا لیکن وہیں کا وہیں رہ گیا۔

''چپ لیٹے رہو''۔ چور نے آہستگی سے کہا۔ اس شخص نے چور کے ہاتھ میں پستول کی نال دیکھی اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔

''اب اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ''۔ چور کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا

اس شخص کی چھوٹی سی کھچڑی داڑھی تھی۔جیسی بلا درد دانت نکالنے والے ڈاکٹروں کے ہوتی ہے وہ جھنجلایا سا معلوم ہوتا تھا۔

''دوسرا ہاتھ بھی اٹھاؤ،تمہارا کیا ہے۔بائیں ہاتھ سے پستول داغ دو۔میں دو تک گنتا ہوں ایک''

''یہ ہاتھ میں نہیں اٹھا سکتا''۔اس شخص نے کہا

''کیوں۔''چور نے پوچھا

''گٹھیا کا درد ہے۔کاندھے میں''

''ورم کے ساتھ۔''

''پہلے ورم تھا۔اب نہیں ہے''

چور اسی طرح دو لمحے ٹھٹکا کھڑا دیکھتا رہا۔پستول کی نال اسی طرح اس شخص کی طرف تھی۔اس نے سنگھار میز کی چیزوں پر نظر دوڑائی۔اس کے بعد اس شخص پر اس کے چہرے پر ایک تشنج سا پھیل گیا۔

''منہ مت بناؤ''۔اس شخص نے کہا۔''اگر تمہیں چوری کرنی ہے تو کرو۔یہ میز پر دھری ہیں سب چیزیں''

''اتفاق سے میں بھی اس موذی مرض گٹھیا کا پرانا مریض ہوں۔میرے بھی یہ بائیں بازو میں ہے کوئی اور ہوتا تو یقیناً تمہارا بایاں پنجہ اٹھتا نہ دیکھ کر دھائیں سے گولی داغ دیتا''

''تمہیں یہ درد کب سے ہے۔''اس شخص نے پوچھا

''چار سال سے۔گٹھیا تو میں سمجھتا ہوں ایسی چیز ہے کہ جان جائے پر گٹھیا نہ جائے''

''کبھی کوڑیالے سانپ کا تیل استعمال کیا۔''

''سیروں۔بلکہ منوں جتنے سانپوں کا تیل میں نے استعمال کیا ہے اگر ان کو باندھ کر رسی بنائی جائے تو آٹھ بار یہاں سے چاند تک اور چاند سے زمین تک آ سکتی ہے''

''بقراطی گولیاں استعمال کیں؟''

''پانچ مہینے متواتر''۔چور نے جواب دیا۔کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ہاں حبوب کبیر،معجون فلاسفہ اور اطریفل جالینوس خاص الخاص استعمال کیے تھے اس سے کچھ فائدہ ہوا۔لیکن زیادہ افاقہ لعوق خراسانی سے ہوا جو میں جیب میں رکھتا تھا۔

''تمہارا درد صبح کو زیادہ ہوتا ہے یا رات کو۔''اس شخص نے دریافت کیا

''رات کو اور رات ہی میرے کام دھندے کا وقت ہوتا ہے''

''اچھا اب یہ ہاتھ نیچا کر لو۔ہاں ہاں کر لو۔جم کر دو چار مہینے ماء اللحم دو آتشہ پی دیکھنا۔فائدہ دیتا ہے''۔چور نے کہا

''ہاں وہ نہیں پیا۔تم یہ بتاؤ۔تمہارے اس بازو میں ٹیس اٹھتی ہے یا ایک سا درد رہتا ہے''۔شخص مذکور بولا

اب چور آ کر اس شخص کی پائینتی بیٹھ گیا اور پستول کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا

''یکا یک ٹیس اٹھتی ہے۔کبھی کبھی تو میں سیڑھیاں بھی نہیں چڑھ پاتا۔بس آدھے راستے میں آ لیتا ہے۔میں تو کہتا ہوں ڈاکٹر کے پاس اس کا علاج ہی نہیں۔سب چور ہیں''

''میرا بھی یہی خیال ہے ہزاروں روپیہ ڈاکٹروں کو کھلا دیا۔دھیلا بھر آرام نہیں۔تمہیں کچھ تو افاقہ ہوا''

''ہاں صبح کو ذرا چین رہتا ہے۔لیکن دوپہر ہوتے ہی پھر جان کو آ جاتی ہے''

''یہی حال ادھر ہے۔ بادل کا ٹکڑا کہیں سے اٹھے۔ اس کی نمی سیدھی میرے کندھے میں آ گھستی ہے اور پھر داڑھ کے درد کی سی اذیت''

چور نے پستول اٹھایا اور ذرا سی جھینپ کے ساتھ جیب میں ڈال لیا۔ تھوڑے تامل کے بعد وہ بولا۔''اچھا یہ بتاؤ کبھی فاسفورس کے تیل کی مالش بھی کرائی ہے''

''بہت اس سے تو سرسوں کا تیل اچھا ہے''

''ٹھیک کہتے ہو۔ ٹھیک کہتے ہو''۔ چور نے کہا۔''بہت معمولی چیز ہے۔ ہاتھ بانہہ پر معمولی خراش میں تو فائدہ کرتا ہے اس سے آگے نہیں۔ ہم دونوں کی حالت اس معاملے میں ایک ہے بس اس کی تو ایک ہی دوا ہے۔ واہ وا۔ کیا موقعے پر یاد آئی۔ شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں وہ ان تیلوں اور معجونوں کے بس کی بات نہیں۔ چلو ذرا کپڑے پہنو۔ باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں''۔ چور نے کہا

''ایک ہفتے سے تو یہ حالت ہے کہ کپڑے بھی خود نہیں پہن پاتا۔ نوکر پہنا دیتا ہے۔ وہ اس وقت سو رہا ہو گا''

''اس کی فکر نہ کرو میں پہناتا ہوں کپڑے۔ ذرا سی ہمت کر کے بستر سے نکل آؤ''

یکا یک اس شخص کو خیال آیا کہ اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔''عجیب قصہ ہے عقل کام نہیں کرتی''

''یہ لو قمیص اپنی۔ ایک صاحب بتاتے تھے کہ اونچے پل کے پاس ایک ڈاکٹر کے پاس مجرب نسخہ ہے کوئی مرہم ہے دو ہفتے میں درد آدھا رہ جاتا ہے''

دروازے سے نکلتے ہوئے صاحب خانہ نے کہا۔''ارے میں پیسے تو بھول ہی چلا تھا۔ ٹھہرو۔ میز پر سے لے لوں''

''نہیں نہیں''۔ چور نے اس کی آستین تھام کر کہا۔''میرے پاس پیسے ہیں فکر مت کرو تمہیں میٹھے تیل میں لونگ ڈال کے بھی ذرا مالش کرانی تھی''۔

☆☆☆☆☆

بنئیے کا عشق

تحریر: او ہنری

ترجمہ: ابن انشاء

ہاروے میکسویل آڑھتی کے دفتر کے معتمد کلرک پچر نے خفیف سی دلچسپی اور تعجب کی ایک جھلک اپنے روکھے، جذبات سے عاری چہرے پر لانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جب اس کا آقائے نعمت ساڑھے نو بجے، تیزی سے اپنی اسٹینوگرافر کے دفتر میں داخل ہوا۔ میکسویل جلدی سے ''سلام میاں پچر'' کہہ کر اپنی میز کی طرف یوں لپکا جیسے ایک زقند میں وہاں پہنچ جانا چاہتا ہو۔ اس کے بعد وہ خطوں اور تاروں کے اس ڈھیر میں غوطہ مار کے رہ گیا جو وہاں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ نوجوان خاتون ایک سال سے میکسویل کی اسٹینوگرافر تھی۔ اس کی خوب صورت یقیناً اسٹینوگرافروں کی دیدہ زیبی سے مختلف قسم کی تھی۔ اس میں بھڑکیلا پن بالکل نہ تھا۔ نہ کوئی زنجیر، نہ بازو بند، نہ لاکٹ، ورنہ ایسی لڑکیاں یوں بنی ٹھنی رہتی ہیں جیسے ابھی کسی دعوت میں جا رہی ہوں۔ اس کا لباس سادہ اور مٹیالے سے کپڑے کا تھا۔ لیکن اس کی قامت زیبا پر خوب سج رہا تھا۔ اس کی سیاہ اور نفیس ٹوپی میں مور کا سبز اور زریں پر، بہار دے رہا تھا۔ اس روز اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی اور تابندگی بھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خواب ناک چمک تھی اور رخسار واقعی سیب معلوم ہو رہے تھے چہرے سے انبساط مترشح تھا اور وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی سی تھی۔

پچر کا استعجاب ابھی دور نہ ہوا تھا۔ آج صبح اس لڑکی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ملحقہ کمرے میں جھٹ سے چلی جاتی جہاں اس کی میز لگی تھی وہ باہر کے دفتر میں ٹھہری رہی، اس کے بشرے سے تذبذب کی کیفیت عیاں تھی۔ ایک بار وہ چل کر میکسویل کی میز کے اتنا قریب پہنچ گئی کہ وہ اس کی وہاں موجودگی سے باخبر ہو گیا۔

وہ مشین جو اس میز پر بیٹھتی تھی اب آدمی نہ رہی اب وہ محض نیو یارک کا ایک معروف دلال تھا۔ غراتے پہیوں اور چراتے اسپرنگوں کے بل پر چلنے والی مشین۔

''کیوں کیا بات ہے۔ کوئی کام ہے۔'' میکسویل نے تیزی نے پوچھا۔ اس کی کھلی ڈاک برف کے ڈھیر کی طرح اس کی میز پر پڑی تھی اس کی تیز و طرار آنکھیں جن سے کسی قسم کے رویے کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ ایک بے صبری کے انداز میں اس کے چہرے پر چمکیں۔

''کچھ نہیں''۔ اسٹینوگرافر نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے ہٹ گئی

''مسٹر پچر''۔ اس نے کلرک سے پوچھا۔ ''کیا مسٹر میکسویل نے کل آپ سے کہا تھا کہ وہ کوئی اسٹینوگرافر رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں کہا تھا''۔ پچر نے جواب دیا۔ ''انہوں نے ایک اسٹینوگرافر کا انتظام کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے کل سہ پہر ملازمت ایجنسی سے کہہ دیا تھا کہ آج صبح امیدوار بھیجیں، اب پونے دس بجے ہیں اور تصویر دار ہیٹ والی یا چیونگ گم کی جگالی کرتی ہوئی، کسی محترمہ نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔

''اس کا یہ مطلب ہے کہ میں بدستور اپنا کام کروں۔ جب تک میری جگہ کوئی اور نہیں آ جاتی''۔ نوجوان دوشیزہ نے کہا اور فوراً اپنی میز پر پہنچ کر اپنی مور پنکھ والی ٹوپی مقررہ جگہ پر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

اگر کسی کو نیویارک کی تجارتی بازار کے کسی دلال کو انتہائی مصروفیت کی ساعتوں میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو وہ انسانی نفسیات اور خصائل کے مطالعے میں کبھی کامل نہیں ہوسکتا کسی شاعر نے کہا ہے

ے لطف زندگی کی مشغول ساعتوں میں

لیکن دلال کی زندگی صرف مصروف و مشغول ہی نہیں ہوتی اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ لفظوں میں اس کا اظہار ممکن نہیں اور اس روز تو میکسویل کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ حساب کی ٹکٹکی برابر ٹک ٹک کیے جا رہی تھی اور فیتہ اگلے جا رہی تھی۔ ٹیلیفون یوں ٹرا رہا تھا جیسے اس پر دورہ پڑا ہو۔ کام سے آنے والے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی جو جنگلے پر سے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ کسی کے انداز میں حسرت تھی۔ کسی کے انداز میں تیزی کوئی جھنجھلایا ہوا تھا۔ کوئی تمتمایا ہوا۔

ہرکاروں کی لین ڈوری ہوئی بندھی تھی۔ کوئی خط اور ٹیلی گرام لا رہا تھا۔ کوئی لے جا رہا تھا۔ دفتر کے کلرکوں کی وہ حالت تھی جیسی کسی طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے ملاحوں کی ہوسکتی ہے۔ پچر کے سوکھے سڑے چہرے پر بھی جوش اور زندگی کی ایک جھلک نمودار ہو گئی تھی۔

سٹے کے بازار میں آندھیاں، طوفان، زلزلے، سب کچھ آ رہے تھے اور ان کے تھپیڑے اور جھٹکے دلال کے دفتر کے در و دیوار کو بھی ہلائے دے رہے تھے۔

میکسویل اپنی کرسی کو دیوار کے ساتھ بھڑائے یوں کام بھگتا رہا تھا جیسے کوئی مشاق رقاص انگلیوں کے بل پر ناچ رہا ہو۔ وہ ٹکٹکی چھوڑ کر ٹیلیفون کی طرف بھاگتا تھا اور میز سے دروازے کی طرف ایسی پھرتی سے جو کسی تماشے کے بھانڈ ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔

کام کے اس طومار اور مصروفیت میں یکا یک دلال کو سنہری بالوں کی ایک لٹ پروں سے زریں شامیانہ نما مخملیں ٹوپی کے نیچے سے جھانکتی نظر آئی جس کے ساتھ سمندری ریچھ کی نقلی کھال کا کوٹ اور اخروٹ برابر شیشے کے منکوں کی مالا بھی دکھائی دی، اس ساز و سامان کے جلو میں دراصل ایک محترمہ کھڑی تھیں اور پچر صاحب ان کا تعارف کرانے کو حاضر ہوئے تھے

''یہ صاحبہ ملازمت ایجنسی کی طرف سے تشریف لائی ہیں۔ اسٹینوگرافر کی جگہ کے لیے'' پچر نے کہا

میکسویل کے ہاتھ چھٹیوں کے طومار اور ٹکٹکی کے فیتے میں الجھے ہوئے تھے اس نے تھوڑا سا چونک کر کہا۔ ''کونسی جگہ کے لیے۔

''اسٹینوگرافر کی جگہ کے لیے''۔ پچر نے کہا۔ ''آپ نے کل کہا تھا کہ ایجنسی سے کہو ایک اسٹینوگرافر بھیج دیں''

''میاں پچر تم گھاس کھا گئے ہو۔ میکسویل نے کہا۔ مجھے کیا ضرورت تھی تم سے ایسی بات کہنے کی۔ مس لیسلی سال بھر سے کام کر رہی ہے اور بہت اچھا کام کرتی ہے جب تک وہ خود نہ چھوڑے ہم اسے نہیں نکالیں گے محترمہ ہمارے ہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے پچر میاں ایجنسی والوں سے کہہ دو کہ ہمیں کسی ملازمہ کی ضرورت نہیں کسی کو مت بھیجیں یہاں''

وہ صاحبہ کرسیاں گراتی' میزوں سے ٹکراتی بک جھک کرتی دفتر سے نکل گئیں۔ پچر نے ایک ساتھی کلرک سے کہا۔ ''بڑے میاں کو دیکھا تم نے۔ ایسا بھی بھلکڑ کیا۔ ادھر بات کی ادھر بھول گئے۔''

کام کا زور اور بڑھ گیا۔ کمپنیوں کے حصص گر رہے تھے۔ چڑھ رہے تھے، خرید و فروخت کے آرڈر یوں آ رہے تھے جیسے انہیں پر لگ گئے ہوں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس کا اپنا سرمایہ کئی جگہ ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ شخص یوں کام کر رہا تھا جیسے کوئی تیز رفتار مشین پورے زوروں سے حرکت میں ہو۔ نہ تامل نہ جھجک گھڑی کی پنڈولم کی طرح تلی تلی چال ہر لفظ جا ہر فیصلہ درست، ہر فعل بروقت، ہنڈیاں تھیں

تمسکات تھے، قرضے تھے، رہن بیع، ہبہ، کفالت، غرضیکہ روپے پیسے کا سودا تھا۔ کہیں انسانی جذبات واردات، فطرت وجبلت کی گنجائش نہ تھی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آیا تو کام کی رفتار سست پڑی۔

میکسویل اپنی میز کے پاس اس حالت میں کھڑا تھا کہ دونوں ہاتھ چھٹیوں اور تاروں سے بھرے ہیں۔ فونٹین پن داہنے کان میں اٹکا ہے اور بال بے ترتیبی سے پیشانی پر پریشان ہیں۔ کھڑکی کھلی تھی۔ یکا یک اس میں سے ایک بھینی لطیف خوشبو کا بھپکا تیرتا ہوا آیا اور دلدل صاحب کے مشام جاں کو معطر کر گیا۔ وہ وہیں ٹھٹکے رہ گئے۔ کیونکہ یہ خوشبوئے پراں مس لیسلی کی طرف سے آئی تھی اور کس کی ہوسکتی تھی یہ خوشبو۔

اس خوشبو نے گو لیسلی کے حسین پیکر کو ان کی چشم تصور کے سامنے لا کھڑا کیا۔ روپے پیسے کی دنیا سکڑ کر اتنی سی۔ نامعلوم دھبے کے برابر رہ گئی اور لیسلی کچھ دور بھی نہیں تھی۔ ساتھ کے کمرے میں تھی۔ بیس قدم کی مسافت تھی۔

''واللہ اب موقع ہے''۔ میکسویل نے اپنے آپ سے نیم سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اب میں اس سے کہہ دوں۔ میں نے اب تک اس سے آخر کہا کیوں نہیں''

وہ لپک کر اندرونی کمرے میں پہنچا اور اپنے کو پل بھر میں اسٹینوگرافر کی میز پر کھڑے پایا۔

لڑکی نے ایک شیریں تبسم کے ساتھ اوپر نظریں اٹھائیں۔ اس کے گالوں پر ایک گلابی جھلک پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں لطف و مہربانی کا رنگ تھا۔ میکسویل نے میز پر کہنی ٹیک دی وہ اپنے ہاتھوں میں ابھی تک چھٹیوں کو طومار تھامے ہوئے تھے اور قلم ابھی تک کنپٹی پر اٹکا ہوا تھا۔

''مس لیسلی''۔ اس نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔ ''میرے پاس ایک دو پل سے زیادہ وقت نہیں۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میری بیوی بنوگی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تم سے عام طریقے پر محبت کرتا۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ضرور ہوں۔ جلدی بولو ادھر وہ لوگ یونین پیسفک کمپنی کے حصوں والے شور مچا رہے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' لڑکی بھونچکی رہ گئی۔ وہ بیٹھی بیٹھی یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم نہیں سمجھتیں۔'' میکسویل نے بے قراری سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں تم مجھ سے شادی کرلو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مس لیسلی میں تم سے یہی کہنا چاہتا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ کم ہوتے ہی میں ایک منٹ کو تمہارے پاس چلا آیا ہوں، لو، لوگ مجھے پکار رہے ہیں کوئی ٹیلیفون آیا ہے۔ ارے میاں ٹھہرو ایک منٹ ٹھہرو مس لیسلی جلدی بتاؤ منظور۔''

اسٹینوگرافر کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ پہلے تو وہ حیرانی میں گم دکھائی دی پھر اس کی متعجب آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ پھر وہ مسکرا دی اور اپنا ایک ہاتھ دلال کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا

''اب میں سمجھ گئی ہاروے۔ اس کاروبار نے تمہارے دماغ کو چکرا دیا ہے۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ پیارے کیا تم اتنی جلدی بھول گئے کہ ہماری شادی اس نکڑ والے گرجا میں کل شام آٹھ بجے ہو بھی گئی۔''

☆☆☆☆☆☆ختم شد☆☆☆☆☆☆

Created by Faraz Akram(farsun@gmail.com)